1857.

سرّو

ڈاکٹر ساجد امجد

آج ہم جس آزادی کی نعمت سے سرفراز ہیں اور جس مُلک کا نام ہماری شناخت بنا ہوا ہے، اِس کے حصُول کی تاریخ یُوں تو بہت طویل ہے مگر اِس تاریخ کے اہم ابواب پر اگر نظر ڈالی جائے تو ایک باب کا نام سرسیّد ہی تجویز کرنا پڑے گا۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ ترتیب میں ان کے بعد ہی آئیں گے۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد برِّصغیر پاک و ہند کے مُسلمانوں پر جو کڑا وقت آیا اور قوم کی کشتی اچانک جس گرداب میں جا پھنسی، اِس سے نجات کا ذریعہ تلاش کرنے والا ایک ہی شخص تھا۔ وہ ساری مخالفتوں اور ملامتوں کی پروا کئے بغیر آگے بڑھا اور قوم کو اس شاہراہ پر لے آیا جو ایک روشن مُستقبل تک لے جاتی تھی۔ اِس کی ہمہ جہت شخصیت اور ذاتِ ہزار صفات کے تمام کارنامے ایک طرف اور یہ واحد کارنامہ ایک طرف سب پر بھاری ہے۔ زیرِ نظر تحریر اسی عظیمُ المرتبت کے سوانح پر مشتمل ہے۔

مُسلمانانِ ہند کے عظیم رہنما، محسنِ اُردو سرسیّد احمد خاں کی سرگزشت

ابھی سورج نے اتنا قد نہیں نکالا تھا کہ اس کی کرنیں خواجہ فرید کی حویلی کے بڑے پھاٹک کا دروازہ پھلانگ کر اندر پہنچتیں۔ دروں سے لپٹی ہوئی چلمنیں منقش ڈوریوں کے کھلنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سقے چھڑکاؤ کرکے جا چکے تھے۔ اصطبل میں گھوڑے ٹہلائے جا رہے تھے۔ خواجہ فرید ابھی مسجد سے نہیں لوٹے تھے۔

اس حویلی کے ایک حصے خواص پورہ کے بیرونی دروازے سے آٹھ نو سال کا ایک بچہ گھوڑی پر سوار تیزی سے باہر آیا۔ کئی سوکھے ہاتھ اسے سلام کرنے کے لیے اٹھے اور گر گئے۔ دروازے پر بیٹھے ہوئے ان ملازموں کی گدلی آنکھوں نے مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔ گھوڑی نے مالک کا اشارہ پاتے ہی زقند بھری اور رستے کو لپیٹنا شروع کردیا۔

جامع مسجد کے اُداس مینار، مایوس قلعے کو روز کی طرح آج بھی بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہ قلعہ تھا جہاں اب اقبال مندی کے ہجوم نے ڈیرا جمانا چھوڑ دیا تھا۔ مغلوں کا آفتابِ عروج، طلوع کی منزلیں پوری کرنے کے بعد غروب کی سرحدوں کے قریب تھا۔ ابھی اندھیرے کی چادر کھلی نہیں تھی۔ شفق زوال کی سرخی، دھندلکوں کو تابشِ جمال بخش رہی تھی۔ اکبر شاہ ثانی، اجداد کے تخت کو سنبھالے بیٹھا تھا لیکن اس حالت میں کہ انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کے سامنے بے بس تھا۔ انگریزوں کے مقرر کردہ وظیفے کی محدود رقم سے اپنے شب و روز میں چاندی کے محل اور سونے کے دروازے بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جب اس خواب کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں دُکھنے لگتیں تو تاجِ شاہانہ میں قرض کے دو چار موتی مزید سجالیتا۔ قرض کا وزن، سر پر سجے تاج سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔

شہرِ دہلی کے انتظام کے لیے انگریز ریذیڈنٹ مقرر تھا جسے اتنا بھی گوارا نہیں تھا کہ کھلے دل سے بادشاہ کا احترام بھی کرسکتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح بادشاہ کی تعظیم کرکے ہم اس کی غیرت و حمیت کو نہیں سلا سکتے۔

انگریزوں کی خواہش تھی کہ دہلی کی بادشاہت رفتہ رفتہ ختم ہوجائے لیکن مغلوں کی سخت جانی اس میں روح پھونکے بغیر اسے زندہ سمجھنے پر بضد تھی۔ اسی طرح دربار سج رہے تھے، اسی طرح مقربوں کو خلعت تقسیم ہو رہے تھے۔ سونے کی طشتریوں میں چاندی کی اشرفیوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

خواجہ فرید کی حویلی سے دور ہوتے ہوتے سوار لڑکا قلعۂ معلیٰ کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ کسی فیاض کی

مٹھی کی طرح کھلتا چلا گیا۔
میر متقی کو ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ اس دن بھی خلعت ملنے کی تاریخ تھی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ اسے لے کر دربار میں آچکے تھے۔ وہ سوتا رہ گیا تھا اس لیے اسے چھوڑ کر آگئے تھے۔

وہ ہرچند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب وہ لال پردے کے قریب پہنچا تو قاعدے کے مطابق اول دربار میں جانے اور آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا۔

کہاریاں ہوادار لائیں۔ بادشاہ سوار ہوئے۔ بیگنیاں مردانہ کپڑے پہنے۔ سر پر پگڑی' کمر میں دوپٹے باندھے' جریب ہاتھ میں لیے ساتھ ساتھ تھیں۔ خواجہ سرا مورچھل کرتے جاتے تھے۔ خبردار ہو' خبردار ہو کا شور مچنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر ہوادار کے قریب کھڑا ہوگیا جہاں اس کے والد پہلے سے کھڑے تھے۔

"تمہارا بیٹا ہے؟" بادشاہ نے اسے دیکھ کر میر متقی سے پوچھا۔

"حضور کا خانہ زاد ہے" میر متقی نے کہا۔

لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے مگر جب تسبیح خانے میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانے میں ایک چبوترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے' اس چبوترے پر بیٹھ گئے۔ جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر لانے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور کمال عنایت سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"کیا نام ہے؟"

"سید احمد۔"

"دیر کیوں کی؟"

حاضرین نے کہا' عرض کرو تقصیر ہوئی مگر وہ چپکا کھڑا رہا۔

"بتاؤ' دیر کیوں کی؟"

"سوگیا تھا" سید احمد نے آنکھیں جھکائے جھکائے کہا۔

"بہت سویرے اٹھا کرو" بادشاہ نے کہا اور ہاتھ چھوڑ دیئے۔

لوگوں نے کہا' آداب بجالاؤ اور وہ آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں اور اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔

تمام درباریوں نے میر متقی کو گھیر لیا اور بادشاہ کی عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔

قلعے سے واپس آتے آتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ چوکیوں کے فرش پر ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھ گیا۔ خواجہ فرید کا پورا کنبہ اسی ایک حویلی میں سمایا ہوا تھا۔ سب کے رہنے کو جدا جدا مکان تھے لیکن کھانے کے وقت سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ بیٹے بیٹیاں' پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں' بیٹوں کی بیویاں سب ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کے آگے خالی رکابیاں رکھ دی گئی تھیں۔

"کون سی چیز کھاؤ گے؟" خواجہ فرید کی بھاری آواز گونجی۔

جس بچے سے پوچھا گیا تھا' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک سالن کی طرف اشارہ کیا۔ خواجہ فرید نے اس کا بتایا ہوا سالن اس کی رکابی میں ڈال دیا۔ یہ گویا اس بات کی اجازت تھی کہ اب کھانا شروع کردیا جائے۔ اجازت ملتے ہی ہر ایک نے اپنی پسند کا سالن اپنی رکابی میں نکال لیا اور کھانا شروع کردیا لیکن اس ادب کے ساتھ کہ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں ایسی خاموشی طاری ہوگئی جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ سید احمد قلعے کی روئیداد سنانے کے لیے بے قرار تھا لیکن اب اسے اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک کھانے کا دور ختم نہیں ہو جاتا اور خواجہ فرید قیلولہ کرنے کے لیے اپنے کمرے میں نہیں چلے جاتے۔

ملازمہ آفتابہ لے کر آگئی۔ کھانے کے بعد خواجہ فرید نے ہاتھ دھوئے۔ سید احمد یہ سمجھا کہ بس اب وہ اٹھ کر چلے جائیں گے لیکن وہ نہ صرف یہ کہ خود اٹھ کر نہیں گئے بلکہ اور سب کو بھی روک لیا۔

"بھئی' میر متقی! یہ تو بتایئے آج قلعے میں کیا گزری۔ صاحب زادے بھی تو تشریف لے گئے تھے؟" انہوں نے سید احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید احمد کے والد سے پوچھا۔

"مجھے تو قلعے سے اب کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ اکبر شاہ ثانی سے دوستانہ مراسم ہیں' اسی مروت میں چلا جاتا ہوں۔"

"ہاں بھائی' سچ کہتے ہو۔ بادشاہ کی حالت دیکھ کر تو رحم آتا ہے۔ حکومت بادشاہ کی ہے' پنشن ایسٹ انڈیا کمپنی مقرر کرتی ہے۔ گھر کسی اور کا انتظام کوئی اور کرتا ہے۔ بادشاہ نہ ہوا' پنجرے کا قیدی ہوگیا۔"

"قبلہ! بربادی کی غزل ابھی ختم نہیں ہوئی" میر متقی نے

کہا ”وزارت اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں۔ راجا سوہن لال، دیوان سرکاری کا مرزا سلیم کی سرکار میں بڑا دخل ہے لہٰذا وزارت کے تمام کام وہی سرانجام دیتے ہیں اور جو وہ کررہے ہیں، اس کا نتیجہ جلد ظاہر ہوجائے گا۔ میں تو بس اس سال چلا گیا تھا۔ اب جانے کا بھی نہیں۔ اپنی جگہ سید احمد کو خلعت کی وصولی کے لیے بھیج دیا کروں گا۔“

”ہاں بھئی، اب ان بچوں ہی کا زمانہ ہے۔ جب تک بادشاہت ہے، انہیں یہ رسم ادا کرنی ہے“ خواجہ فرید نے کہا۔ ”یہ آج بھی تو گئے تھے، کیا ہوا وہاں؟“

میر متقی نے تمام تفصیل لفظ بہ لفظ سنادی لیکن ساتھ ہی اس کی شکایت بھی کی۔

”انہوں نے پوچھا، دیر کیوں کی تو اسے کہنا چاہیے تھا، تقصیر ہوئی لیکن موصوف نے فرمایا، سوگیا تھا۔ بادشاہوں کے حضور کوئی اس طرح بات کرتا ہے؟“

”اچھا! انہوں نے یہ کہا۔ بھئی، آپ کو یہ بات پسند نہ آئی ہو مگر ہمیں تو آئی۔ سید احمد کی بے خوفی اور راست گوئی ہمیں اچھی لگی۔ جو بات سچ تھی، وہ اس نے کہہ دی۔ اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے؟“

میر متقی اپنے دفاع میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن خواجہ فرید کے سامنے کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

خواجہ فرید کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں دیکھ کر اور سب لوگ بھی اٹھ گئے۔ سید احمد کو بھی اٹھنا پڑا۔ جو تفصیل اسے بتانی تھی، اس کے والد نے بتادی تھی، اس کے دل کو اس کا بڑا رنج تھا۔

اس کا ذہن اب اس گتھی کو سلجھا رہا تھا کہ بادشاہ کے سامنے اس کا طرزِ تخاطب درست تھا یا غلط؟ ابا جانی ٹھیک کہتے ہیں یا نانا حضور؟

صدر دالان کے وسط سے دسترخوان کا اٹھنا تھا کہ پوری حویلی قیلولے کی حالت میں چلی گئی۔ باتوں کے چراغ بجھ گئے۔ درودیوار سناٹے کی اشرفیاں نثار کرنے لگے لیکن اس کی نیند، دن کے وقت جگنو کی روشنی کی طرح آنکھوں سے غائب تھی۔

•

بادشاہ کا نورانی چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ پھر ریذیڈنٹ بہادر کا چہرہ اس کے سامنے آیا۔ بادشاہ کے پاس اور کیا تھا۔ یہ کہ اس کا رنگ انگریزوں سے بھی گورا تھا اور اس کی ریش دراز اس کے رنگ سے بھی زیادہ سپید۔ انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر کیسی چمک تھی۔ لگتا تھا، بادشاہ کو ہوادار سے اتار کر خود بیٹھ جائے گا۔ اس کی چال کیسی پُروقار تھی! اس کے لباس میں کیسی چستی تھی۔ کیا خبر، ہی کسی دن بادشاہ بن جائے اور مجھے اس کے سامنے بھی جانا پڑے لہٰذا مجھے معلوم تو ہو کہ بادشاہوں کے سامنے کیسے گفتگو کی جاتی ہے۔ ابا تو میری مخالفت کرہی چکے۔ بی اماں سے پوچھنا چاہیے۔ وہ تو بہت عقل مند سمجھی جاتی ہیں۔ نانا تک ہر بات میں ان سے ہی مشورہ لیتے ہیں۔

اس نے چپکے سے ماں کو بیدار کیا ”بی اماں، مجھے ایک بات تو بتایئے۔“

”یہ کون سا طریقہ ہے بات پوچھنے کا۔ مجھ سوتی کو اٹھادیا۔ جب اٹھ جاتی تو پوچھ لیتے۔“

”بات ہی ایسی تھی کہ مجھے اسی وقت جواب چاہیے تھا۔“

”اچھا پوچھو۔ ویسے بھی میں اٹھنے ہی والی تھی۔“

سید احمد نے انہیں نانا اور ابا کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد دلائی کیونکہ وہ بھی وہاں موجود تھیں۔

”آپ بتایئے، میں نے بادشاہ کو صحیح جواب دیا تھا یا غلط؟“

”تم نے بالکل ٹھیک جواب دیا۔ آدمی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ چاہے بادشاہ ہی سامنے کیوں نہ ہو۔“

”پھر ابا جانی یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ بادشاہوں کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کی جاتی؟“

”بڑے جو کچھ کہتے ہیں، اس کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن تم یہ سمجھ لو کہ تمہیں زندگی بھر سچ بولنا ہے۔ کسی مصلحت کی پروا کیے بغیر وہ کہنا ہے جسے تم سچ سمجھتے ہو۔“

سید احمد نے ماں کی نصیحت کو غور سے سنا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔

میر متقی نہایت آزاد منش تھے۔ گھر کے بکھیڑوں سے دور رہتے تھے۔ خاص طور پر جب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہوگئے تھے، ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر سید احمد کی والدہ پر ہی آگیا تھا۔

سید احمد کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا ان میں خداداد ملکہ تھا۔ اولاد کو آنکھوں کی پتلیوں میں رکھ کر پال رہی تھیں۔ ان کی اولاد کیا کررہی ہے، کہاں ہے؟ انہیں سب خبر تھی۔ سید احمد کے دو بڑے بہن

بھائی سید احمد اور صفیتہ النسا بھی تھے لیکن سب سے زیادہ محنت انہیں سید احمد کی تربیت میں کرنی پڑ رہی تھی۔ اس کی شوخیاں اور شرارتیں ہر روز کوئی گل کھلاتی تھیں۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا لیکن نیند نے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ اس خوشی میں اسے نیند نہیں آرہی تھی کہ اس نے بادشاہ کے سامنے سچ بول کر کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

دھوپ نے اس کے کھیلنے کا میدان خالی کردیا تھا۔ آسمان پر پتنگیں اور زمین پر کھیلتے ہوئے بچے ہی تو اسے اچھے لگتے تھے۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے شوق میں بڑوں کی سخت گیری حائل نہیں تھی۔ کھیلنے کودنے کی قطعی بندی نہیں تھی البتہ یہ آزادی نہیں تھی کہ جہاں چاہے اور جس کے ساتھ چاہے کھیلتا پھرے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماموں زاد، خالہ زاد اور دیگر نزدیکی رشتے داروں کے چودہ پندرہ لڑکے اس کے ہم سن تھے اور حویلی، اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں۔

اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور بستر چھوڑ دیا۔ لڑکوں کا غول اس کا منتظر تھا "آؤ، آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔"

شام ہوئی اور چراغ جلے تو سب بچے پروانوں کی طرح چھت سے اترے اور اپنے اپنے مکانوں میں پہنچ کر چراغ کے سامنے بیٹھ گئے۔ کسی نے "کریما" کے صفحات کھولے، کسی نے "خالق باری" کو یاد کرنا شروع کردیا کیونکہ سب بچے چراغ جلنے کے بعد خواجہ فرید کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کو سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو کچھ یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔

وہ بھی اپنا سبق بے دلی سے دہرا رہا تھا۔ شوق سے نہیں، نانا کے ڈر سے۔ آخر اس کا بلاوا آگیا۔

اس نے اچھی طرح ہاتھ صاف کیے کہ کہیں روشنائی کا کوئی دھبا ہاتھوں پر نہ رہ جائے، سر پر ٹوپی رکھی اور کتاب ہاتھ میں لے کر سنانے پہنچ گیا۔

دن بھر تو خیالوں کی تلواروں سے لڑتا رہا تھا، سبق کیا یاد ... ہوتا اور آج ہی سے کیا، سبق تو اسے اکثر یاد نہیں ہوتا تھا۔

"تمہارا صرف مکتب جانا ہی کافی نہیں۔ تمہارے لیے اب مجھے کچھ اور بھی سوچنا پڑے گا۔" خواجہ فرید نے کہا اور دوسرے بچے کا سبق سننے میں مشغول ہوگئے۔

دوسرے دن خود بخود معلوم ہوگیا کہ اس کے لیے خواجہ فرید نے کیا سوچا تھا۔

مولوی حمید الدین ایک ذی علم بزرگ تھے اور اس حویلی پر قدیم سے نوکر تھے۔ سید احمد کے ماموؤں وغیرہ کو انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔ اب انہیں یہ ذمّے داری سونپی گئی تھی کہ وہ سید احمد کو پڑھایا کریں گے۔

○☆○

دبیرالدولہ، امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ لائق، دانش مند، صاحبِ علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ جاکر علامہ تفضل حسین خاں سے جبکہ نواب آصف الدولہ زندہ تھے، ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی اور پھر اپنی کوششوں سے اس میں ایسا نام کمایا تھا کہ دور دور تک ان کی ریاضی دانی کی دھوم تھی۔

جن دنوں وہ کلکتہ میں سرکار انگلشیہ کی ملازمت کر رہے تھے، اکبر شاہ ثانی نے انہیں کلکتہ سے بلاکر خلعتِ وزارت اور خطابات عنایت کیے۔

انہوں نے کارِ وزارت سنبھالتے ہی آمدنی اور خرچ برابر کرنے میں بڑی دور رس کوششیں کیں۔ شاہزادوں، بیگمات اور عملہ شاہی کی تنخواہیں کم کردیں اور اسی طرح بعض غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کردیے۔

ان کی کوششوں سے کئی لاکھ کا قرض اتر گیا لیکن قلعے میں ان کے اقدامات سے عام ناراضی پھیل گئی۔ آخر انہیں عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کلکتہ لوٹ گئے۔

ایک مرتبہ پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلاکر عہدۂ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی بعض وجوہات سے تین برس وزارتی امور کی انجام دہی کے بعد بہ صلاح جرنیل آکٹرلونی جو دلی میں ریذیڈنٹ تھے، استعفیٰ دے دیا۔

مہدی قلی خاں، وزیر فرخ سیر نے اپنی وزارت کے زمانے میں تراہہ بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دیوان خانہ، فیل خانہ اور اصطبل وغیرہ متعدد مکانات تھے۔ اس کو خواجہ فرید نے خرید لیا تھا اور یہ حویلی، خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔

دلی ہی میں ایک اور معزز خاندان سید برہان الدین کا تھا۔

سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ اپنی جمعیت کے ساتھ ایک مورچے پر متعین تھے۔ جب اس مورچے کو انہوں نے بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کرلیا تو عالمگیر نے ان کو یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا۔

انہی سید محمد دوست کے بیٹے سید برہان نے دکن سے آکر دلی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بیٹے سید عماد اور ان کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی کو عالمگیر ثانی نے خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات وپانصد سوار ودواسپ وسہ اسپ دیا۔ جب شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو خطاب جوالدولہ کیا گیا اور عہدہ قضائے لشکر عنایت ہوا۔

سید ہادی اور خواجہ فرید میں بہت رسم وراہ تھی۔

جب سید ہادی قضائے الٰہی سے رحلت کر گئے تو ان کے بیٹے میر متقی، والد کی دوستی کا حق ادا کرتے رہے۔ خواجہ فرید بھی انہیں مثلِ اولاد ہی کے سمجھتے تھے چنانچہ جب وہ پہلی مرتبہ اکبر شاہ ثانی کے بلاوے پر دلی آئے تو انہوں نے اپنی بیٹی عزیز النسا بیگم کی شادی میر متقی سے کردی۔

میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب گوشۂ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ نادر گردی اور مرہٹہ گردی میں لٹ چکا تھا اور اب اس کے اکثر حصے منہدم ہوگئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے، وہی ان کے اٹھنے بیٹھنے کے محل تھے۔ شادی کے بعد خواجہ فرید کی حویلی میں آرہے۔

○☆○

سید احمد کی تعلیم جاری تھی کہ مولوی حمید الدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اور لوگ پڑھانے آتے رہے لیکن سید احمد کے شوق کا شعلہ ایسا سرد تھا کہ بھڑکنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ اس نے نہایت بے دلی کے ساتھ فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا تھا کہ خواجہ فرید کا انتقال ہوگیا۔

نگرانی کرنے والی دو آنکھیں کم ہوگئیں۔ والد کو تو پرواہی نہیں تھی البتہ والدہ اس کی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہونے پاتی تھیں لیکن اس کا یہ عالم تھا کہ پڑھائی میں کورا اور ہر شرارت میں سب سے آگے۔ اس میں عام بچوں جیسی ذہانت بھی نہیں تھی یا تھی تو وہ اسے استعمال نہیں کررہا تھا۔ جسمانی حالت البتہ بہت اچھی تھی اور وہ اپنی طاقت کا جا و بے جا استعمال کرتا بھی رہتا تھا۔ ایک دن تو غضب ہی ہوگیا۔ گھر میں ایک پرانا بوڑھا نوکر تھا۔ کسی بات پر اس سے اَن بن ہوگئی۔ سید احمد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس بوڑھے کے تھپڑ ماردیا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ والدہ کو خبر ہوگئی۔

امیرزادوں کی دنیا میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ موجوں کی سرکشی میں تنکے کی بساط ہی کیا لیکن اس کی والدہ کسی اور ڈھب سے اس کی تربیت کررہی تھیں۔ ان کے

نام ــــ سید احمد خاں

خطاب ــــ سر

اعزاز ــــ سی ایس آئی اور کے سی ایس آئی

والد ــــ میر متقی

والدہ ــــ عزیز النساء

پیدائش ــــ ۱۷ویں اکتوبر ۱۸۱۷ء

وفات ــــ ۲۷ویں مارچ ۱۸۹۸ء

تدفین ــــ علی گڑھ، ۲۸ویں مارچ ۱۸۹۸ء

تصورات کا تو محل ہی مسمار ہوگیا۔

"اسے گھر سے نکال دو" انہوں نے ایک ملازمہ سے کہا "جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔"

نوکرانی کچھ دیر تو ان کا منہ تکتی رہی کہ بیگم کہہ کیا رہی ہیں اور پھر ان کے جلال سے ڈر کر سید احمد کا ہاتھ پکڑا اور باہر سڑک پر لاکر چھوڑدیا۔ قریب تھا کہ وہ کسی طرف نکل جاتا اور شاید کبھی لوٹ کر نہ آتا کہ خالہ کے گھر سے ایک نوکرانی باہر آئی اور اسے خالہ کے پاس لے گئی۔

"دیکھو! آپا جی تم سے بہت خفا ہیں۔ میں تمہیں کوٹھے پر ایک مکان میں چھپادیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہوں گی۔"

وہ تین دن وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن اس کی خالہ یہ سوچ کر اسے بہن کے پاس لے گئیں کہ اب تک غصہ اتر چکا ہوگا۔

"آپا، اب اسے معاف کردو، بہت ہوچکا۔"

"میں کون ہوتی ہوں اسے معاف کرنے والی۔"

"تو کیا جان ہی لے کر چھوڑو گی۔ دیکھو تو صدمے سے کیسا زعفرانی رنگ ہوگیا ہے اس کا۔"

"جس کے اس نے تھپڑ مارا ہے، پہلے اس سے معافی مانگے۔ وہ معاف کردے گا تو میں بھی معاف کردوں گی۔"

"تو کیا اب وہ اس نوکر سے معافی مانگے گا؟ بس کہہ دیا کہ آئندہ نہیں کرے گا۔"

"کیوں، کیا نوکر اللہ کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اسے معلوم تو ہو کہ دنیا میں ہر آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ نوکر کی بھی، آقا کی بھی۔ کسی بزرگ پر ایں کا ہاتھ اٹھا کیسے؟"

بات ان کی معقول تھی اور پھر اس شرط کے سوا وہ معاف کرنے پر تیار بھی نہیں تھیں لہٰذا سید احمد کو ڈیوڑھی

میں جاکر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی پڑی تب قصور معاف ہوا۔

یہ ایسی ٹھوکر تھی جس نے کچھ دن کے لیے سید احمد کو سنبھلنے پر مجبور کردیا۔

اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد عربی شروع کی۔ شرح ملا، شرح تہذیب مختصر معانی اور ایسی ہی چند کتابیں اور پڑھیں لیکن طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور عدم توجہی کے ساتھ۔

دلی کے امیرزادوں کے اچھے برُے ہزار شوق تھے لیکن شرفا میں تیراکی اور تیراندازی کے جلسوں کی بڑی دھوم تھی۔

سید احمد کے والد ان جلسوں میں خوب حصہ لیتے تھے۔ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا اور دوسری طرف میر متقی کے شاگرد۔ نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہوتے تھے اور مغرب کی نماز ادا کرکے اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔

سید احمد بھی ان مقابلوں میں شریک ہونے لگا۔ پڑھنے میں وہ جتنا کمزور تھا، تیراکی میں بہت جلد اتنا ہی مشاق ہوگیا۔ دراصل اس کا مزاج ہی ایسا تھا کہ پڑھنے لکھنے سے زیادہ کھیل کود میں دل لگتا تھا۔

تیراندازی کی صحبتیں تو خود اس کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی کی مشق شروع ہوجاتی تھی۔ شاہزادے رئیس اور شوقین ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ بھی پابندی سے یہاں آنے لگا اور بہت جلد اچھی خاصی مشق فراہم ہوگئی۔

نواب زین العابدین خاں کو پتنگ بازی کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ اپنی پتنگیں خود بناتے تھے اور نئی نئی جدتیں کرتے رہتے تھے۔ ان میں ایجادواختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ انہوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کئے تھے اور اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا۔

ان کی صحبت میں سید احمد نے یہ شوق بھی اختیار کرلیا۔

اس کا ہر شوق اسے تعلیم سے دور لے جارہا تھا لیکن اس کی ماں پھر بھی مطمئن تھی کہ یہ کچھ ایسے غلط شوق نہیں کہ انسان کو گمراہی کی طرف لے جائیں۔

نواب زین العابدین خاں کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجے کی دست گاہ تھی۔ تمام آلاتِ رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔

سید احمد کا ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہوا تو اپنا خاندانی علم ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا۔ وہ ایک روز اپنے ماموں کے ساتھ ان کے کتب خانے میں بیٹھا تھا کہ اس کی نظر ریاضی کے موضوع پر لکھے گئے ایک رسالے پر پڑی۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"یہ تمہارے نانا جان کا ہاتھ سے لکھا ہوا رسالہ ہے۔" اس کے ماموں نے کہا "ایسے کئی اور رسالے بھی ہیں میرے پاس لیکن افسوس کہ ہمارے خاندان میں میرے بعد اسے سنبھال کر رکھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا، پڑھنا اور سمجھنا تو بڑی بات۔"

"ماموں جان! اگر اس علم میں مجھے کچھ دسترس حاصل ہوجائے؟"

"برخوردار! یہ علم اتنا آسان نہیں۔ ایک مسئلے کو حل کرنے کے لیے چراغ کی بتی کی طرح جلنا پڑتا ہے۔"

"ماموں جان، میں خالی ہی تو گھومتا پھرتا ہوں۔ کتابوں میں میرا جی بھی نہیں لگتا۔ کیا خبر ریاضی کی گتھیاں مجھے راس آجائیں۔"

"الجھنا چاہتے ہو تو الجھ لو۔ آج ہی سے پڑھنا شروع کردو۔"

ان کے پاس ریاضی کی کچھ درسی کتابیں تھیں، انہوں نے وہ سب اس کے سامنے رکھ دیں "تمہاری طبیعت ابتدا میں الجھے گی ضرور لیکن اس منزل سے گزر گئے تو پھر اس سے زیادہ دلچسپ کوئی علم نہیں ہے۔"

سید احمد کی طبیعت میں جلد بھڑک اٹھنے والا آتش گیر مادہ بہت تھا۔ وہ جس چیز کو پسند کرتا، اسے حاصل کرنے کے لیے ساری کشتیاں جلادیتا تھا۔ پھر وہ کسی مخالفت، کسی رکاوٹ کی پروا نہ کرتا لیکن بہت جلد اس سے اکتا بھی جاتا تھا۔ اس کے اس مزاج نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ اس کا شوق دیکھ کر زین العابدین خاں کو اس سے بڑی امیدیں تھیں لیکن آہستہ آہستہ چراغ شوق کی لو مدھم ہونے لگی۔ وہ ابتدائی کتابوں ہی میں بھٹک کر رہ گیا۔ اس کے مزاج نے کئی اور نئی راہیں ڈھونڈلیں۔

اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ حویلی میں بند کرکے رکھا جاسکتا۔ لڑکپن کی حدوں میں داخل ہوگیا تھا۔ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے اپنی عمر سے زیادہ کا لگتا تھا۔ سرخ سپید رنگ، پیشانی بلند، سربڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا۔ روشن آنکھیں۔ جسم نہایت فربہ، ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست۔ بلاشبہ اسے خوبصورت کہا

جا سکتا تھا۔ لباس اور وضع قطع میں بانک پن۔ شباب کا قاصد دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ وہ حویلی سے باہر نکلا تو دنیا ہی دوسری تھی۔ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اقبال کا خاتمہ ہوچکا تھا اس لیے ان خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش ونشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں۔ بے فکرا امیرزادے عیاشی اور لہوولعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے۔ عوام تو جہالت اور ریت رسموں کے اندھیروں میں ڈوبے کسی نادیدہ انجام کے منتظر تھے۔ تدبیریں زنگ آلود ہوگئی تھیں، تعویذ گنڈوں، نذرونیاز کا دوردورہ تھا۔ امیروں کا حال یہ کہ دن رات بٹیریں لڑانے اور کبوتر اڑانے اور اسی طرح کی تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا کچھ کام دھندا نہیں۔

شرفا کا طبقہ اور معزز خاندان ہر معاشرے کی روح ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے تہذیب اور علوم وفنون کو فروغ ہوتا ہے بلکہ گرتے ہوئے معاشرے کو سنبھالنے کی توقعات بھی انہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ سب سے بری حالت اسی طبقے کی تھی۔ وہ خاندان جو کبھی مخزن فضل وکمال تھے، اب ان کے پاس جھوٹی شان اور نخوت وتکبر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑ رہے تھے۔ سید احمد کی جوانی ان عیش کدوں کی خاک چھانے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ مراسم نے طول کھینچا اور امیرزادوں سے صحبتیں رہنے لگیں۔ گھر کی تربیت پردے کے پیچھے کہیں جاکر چھپ گئی۔ ہولی کے جلسے، پھول والوں کی سیر، بسنت کے میلے، راگ رنگ کی محفلیں۔ کون سی جگہ تھی جہاں وہ نہیں گیا۔

جوانی کی نمائش میں اگر حسن کی دکانیں نہ ہوں تو سیر کا لطف ہی کیا۔ اس کمی کو طوائفوں کے نازوانداز سے پورا کیا جارہا تھا اور اسی کو تہذیب سمجھا جارہا تھا۔ ایک نشہ تھا جو آہستہ آہستہ سب کو سلائے دے رہا تھا۔ امیرزادوں کے محلات موسیقی کی تانوں سے گونج رہے تھے۔ سید احمد بھی اس متعدی مرض سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔

سازوں پہ رکھی انگلیاں، روشنی کو شرمانے والی تانیں، گھمیریاں لیتے ہوئے بدن، پشواز کے بھاری دامن کمر تک اٹھتے ہوئے۔ سرخ ریشمیں زیرجاموں کی جھلک، خادموں کے پنکھے اور چنور۔ سرخ غالیچوں پر کارچوبی گاؤتکیے، ابروؤں کی جنبش سے سلام کرتے ہوئے چہرے۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جس کی جوانی کے مسافر کو تلاش ہوتی ہے۔ اس کا شوق اسے

چند اہم ترین تصانیف

آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، لائل محمڈنز آف انڈیا، تحقیق لفظ نصاریٰ، تبیین الکلام، سفرنامۂ لندن (مسافران لندن)، خطبات احمدیہ، رسال ابطال غلامی، احکام طعام اہلِ کتاب، تفسیر القرآن، جواب امہات المومنین۔

کوچہ ہائے نشاط کی سیر کراتا پھر رہا تھا۔

وہ دوستوں کے جھرمٹ میں، ستاروں میں چاند بنا بیٹھا تھا۔ کتھک کے مراحل طے ہورہے تھے۔ دیوانگی کا بھنور تھا کہ گردش میں تھا۔ پھول توڑنے اور دل جوڑنے کا موسم تھا جو اس کی زندگی میں کہیں سے آگیا تھا۔ اس کے بدن میں چنگاریاں مسکرا رہی تھیں۔ پگھلتی آگ تھی جو آبگینۂ دل میں اترتی جارہی تھی۔

اس روز وہ دسترخوان چنے جانے کا انتظار کررہا تھا کہ اس کے نام ایک دعوت نامہ آیا۔ زرد رنگ کے لفافے میں زرد کاغذ تھا جس میں یہ اطلاع تھی کہ خواجہ محمد اشرف کے مکان پر بسنت کا جلسہ ہے جس میں نامی طوائفیں تشریف لائیں گی۔ اسے وہاں پہنچنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بسنت کی رعایت سے دسترخوان پر چنے ہوئے تمام کھانے اسے بسنتی رنگ کے نظر آنے لگے۔ مصری کی ڈلیوں نے اس کا منہ میٹھا کردیا۔ اس رقعے کا ہر لفظ مصری کی ڈلی ہی تو تھا۔

تاریخ مقررہ پر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور خواجہ محمد اشرف کے مکان پر پہنچ گیا۔ بسنت کا جلسہ تھا لہٰذا ہر منظر زرد لباس کا پیکر تھا۔ مکان میں بچھے زرد فرش پر قدموں کا بوجھ ڈالتا ہوا وہ دالان میں پہنچ گیا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترا تھا جس میں حوض بنا ہوا تھا۔ اہتمام یہ تھا کہ اس حوض میں بھی زرد پانی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا، اس میں بھی زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمن کے عین وسط میں زرد فرش پر گاؤتکیوں کے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان تکیوں سے ٹیک لگاکر بیٹھنے والے دونوں جہاں سے ہاتھ اٹھاکر بیٹھے تھے۔ نامی گرامی طوائفیں زرد لباس پہنے، جوگنیں بنی ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔ کوئی مورت، کوئی ماہ کوئی طلعت۔ بدن سانچے میں ڈھلے ہوئے، بال کھلے ہوئے جیسے ناگ پلے ہوئے۔ آنکھوں میں شرارت، چہروں پر ملاحت۔ کوئی مہتابی کوئی آفتابی۔ عجیب جوگنیں تھیں۔ سولہ سنگھار سے آراستہ۔ اپنے اپنے فن میں ہوشیار، دل لینے کو تیار۔ کچھ

دیر قہقہوں کے بادل اُمڈتے برستے رہے پھر ساز جڑنے لگے۔ ہر طوائف باری باری بیٹھ کر قیامت اٹھاتی رہی۔ کسی نے خیال چھیڑا' کسی نے دھرپت۔ ہر لفظ یوں ادا ہوتا تھا جیسے چاندی کی اشرفیاں پیلے فرش پر ڈھیر ہو رہی ہیں جیسے مولسری کے پھول ہیں کہ انبار در انبار پھیلتے جا رہے ہیں۔ ہوش خود بے ہوش تھا پھر ہوش کسے رہتا۔ گانے کا دور ختم ہوا تو رقاصاؤں نے در و دیوار کو گھما دیا۔ کب تلوار چلی کب گردن کٹی۔ ہوش تو اس وقت آیا جب یہ جلسہ موقوف ہوا۔ اور ہوش بھی آیا تو یہ کہ یہ جلسہ تو ختم ہوا اب ان نازنینوں کو دیکھنے کا اور موقع کہاں ملے گا۔

ایسے موقعوں کی کمی نہیں تھی۔ کہیں فن کے نام پر کہیں تہذیب کے نام پر' کہیں امارت کی نمائش کے نام پر ایسے مواقع برابر آنکھیں بچھاتے رہتے تھے۔ خود سید احمد کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بڑے بڑے نامی گویئے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔

خواجہ میر درد کے سجادہ نشیں ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بھی بڑے بڑے نامی گویئے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گائے جاتے تھے۔ میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے' بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔

ایک جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضع دار تھے۔ جنا نامی ایک طوائف اپنا پیشہ چھوڑ کر ان کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویئے بہادر خاں ستارن اور میر ناصر احمد خاں جمع ہوتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ سید احمد بھی ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

یہ تو وہ جلسے تھے جو کسی حد تک متین اور مہذب سمجھے جاتے تھے لیکن اسی دلی میں مخرب اخلاق اور ناشائستہ محفلوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

سید احمد ان سب جلسوں کی جان بنا ہوا تھا۔ ہوس کی ہوا میں اڑتا پھر رہا تھا۔ ان اشتغال سے اس کی دل بستگی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اب یہ خدشہ ہونے لگا کہ اب وہ بالکل ہی ہاتھ سے گیا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ لگتا ہی نہیں تھا۔ ناچ' مجرے' عیش' نشاط یہی اس کی زندگی تھی۔

اس کی والدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی شادی کروی جائے۔ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی اس کی خالہ زاد سے ہو گئی۔

شادی ایک دن تھی' جشن مہینوں تک جاری رہا۔ ہر شب' شبِ برات کی طرح آتش بازی چھوٹتی رہی۔ نذرانے ہُن بن کر برستے رہے۔

والدہ تو یہ سمجھی بیٹھی تھیں کہ دلہن گھر میں آئے گی تو باہر کے دروازے خود بخود بند ہو جائیں گے۔ کچھ دن ایسا نظر بھی آیا لیکن بازار کی رونق گھر میں کہاں۔ چنے ہوئے دوپٹوں اور گوندھی ہوئی چوٹی سے جلد ہی دل اوب گیا۔ کوچۂ نشاط کے چکر کم نہیں ہوئے۔ پڑھنا کب کا چھوٹ چکا تھا البتہ اپنے طور پر کتابوں کے مطالعے کا شوق جاری تھا اور دلی میں جو اہلِ علم اور فارسی دانی میں نامور تھے جیسے صہبائی' غالب اور صدرالدین آزردہ وغیرہ' ان سے ملنے اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع بھی ملتا تھا کیونکہ اس وقت ادبی ذوق رکھنا بھی امیرانہ شان کی پہچان تھی۔

یہی شب و روز تھے کہ چمن میں خزاں کی طرح ایک پیغام آیا۔ میر متقی گوشہ نشیں تو کب کے ہو چکے تھے گوشۂ قبر کو آباد کرنے کا خیال آیا تو ایک دن چپکے سے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے اپنے پیر شاہ غلام علی کی قبر کے پائنتی اپنے لیے پہلے ہی قبر کھدوالی تھی۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

دھوپ اتنی تیز نہیں تھی لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ جب سورج پوری آنکھیں کھولے گا تو بدن جھلسا دے گا۔ یہ اندازہ اسی وقت ہوا کہ جب میر متقی کے نام آنے والی کئی تنخواہیں ختم ہو گئیں۔

میر متقی اور راجا سوہن لال دیوان' قلعۂ معلیٰ کے درمیان ان بن تھی۔ اس کی وجہ سے انہوں نے قلعے کا جانا ترک کیا تھا۔ یہ شخص میر متقی کی زندگی ہی میں ان کی تنخواہ میں کتر بیونت کرنے لگا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اسے موقع مل گیا۔ سید احمد کی والدہ کے نام معمولی سی تنخواہ جاری ہوئی۔ چند جاگیریں جو ملی ہوئی تھیں' وہ بھی ضبط ہو گئیں۔

اس نے کتنے ہی امیر زادوں کو دیکھا تھا جو حالات بگڑنے کے سبب اپنے سے بہتر امیروں کی ڈیوڑھی پر مثل نوکروں کے پڑے ہوئے تھے۔ مصاحبت میں دن گزار رہے تھے۔ ایسی زندگی گزارنے کے خیال ہی سے اسے پھریری آگئی۔ ایسی ذلت سے نوکری بہتر ہے۔ باپ کے مرتے ہی اس کے دل میں ذمے داری نے سر اٹھایا۔ تعلیم ادھوری تھی' کوئی ہنر ہاتھ

میں نہیں تھا۔ نوکری کرے تو کیا کرے۔

رشتے داروں کا مشورہ تھا کہ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح قلعے کی نوکری اختیار کرے لیکن بادشاہ کی بے بسی اس کی نظر میں تھی۔ اس نے سوچا، جب پرستش ہی کرنی ہے تو چراغ کی کیوں کروں، سورج کی نہ کروں۔ اس نے قلعے کا سہارا ایک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ یہ خیال اس لیے بھی آیا کہ اس کے ایک خالو مولوی خلیل اللہ دلی میں صدر امین تھے۔ وہ اس کی مدد بھی کرسکتے تھے، اسے نوکری بھی دلا سکتے تھے۔ وہ سوار ہوا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔

"میں چاہتا ہوں، آپ کی کچہری میں مجھے کوئی اسامی مل جائے۔"

"اسامی تو مل سکتی ہے لیکن تمہیں کام سے واقفیت بھی تو نہیں ہے۔"

"کام تو سیکھا بھی جا سکتا ہے۔"

"اگر تم میں سیکھنے کی قابلیت ہے اور شوق ہے تو آجایا کرو۔ عدالت کی کارروائیوں سے واقفیت ہوجائے تو نوکری کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔"

سید احمد کچہری جانے لگا۔ چند مہینوں میں اسے انگریزی قوانین سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی۔ مولوی خلیل اللہ نے اس کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جوکہ فیصلے کے لیے صدر امینی میں آتے تھے، اپنی کچہری میں سررشتے دار مقرر کرادیا۔

اسے اس کام پر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن دلی میں جج ہوکر آئے۔ سید احمد کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے گیا۔ دیکھ کر خوش ہوئے اور یہ جان کر مزید خوش ہوئے کہ وہ کچہری میں نوکری کر رہا ہے۔

"ہم تم کو سیشن کورٹ میں سررشتے دار دیکھنا مانگتا ہے۔ تم ابھی ادھر کام کریں گا" رابرٹ ہملٹن نے اسے پیش کش کی۔

"نو سر! یہ کام مشکل ہے۔ میں خود میں اس کام کی قابلیت نہیں پاتا۔"

"جب ہم ادھر موجود ہے تو تم کاہے کو فکر کرتا۔"

"نہیں سر! میں صرف وہ کام کرنے کا قائل ہوں جسے میں اپنی قابلیت سے کرسکتا ہوں۔"

انہوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ نہیں مانا اور بدستور صدر امینی میں کام کرتا رہا۔

سرسید کے چند کارنامے

رسالہ اسباب بغاوتِ ہند لکھنا اور مسلمانوں کی وکالت کرنا۔ مدرسہ مراد آباد کا قیام۔ انتظام قحط اور یتیموں کی حفاظت کا بندوبست۔ رسائل لائل محمڈنز آف انڈیا لکھنا تاکہ انگریزوں پر مسلمانوں کی وفاداری ظاہر کی جائے۔ تفسیر بائبل۔ سائنٹی فک سوسائٹی کا قیام۔ سوسائٹی کے اخبار کا اجرا۔ غازی پور میں مدرسے کا قیام۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن۔ اردو زبان کی حمایت، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو۔ ولایت کا سفر۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قیام۔ محمڈن کالج کا قیام اور محض چندے کی رقم سے عظیم الشان عمارت کی تعمیر۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام۔ کونسل کی ممبری۔ پبلک سروس کمیشن کی ممبری، نیشنل انڈین کانگریس کی مخالفت اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کرنا۔

○☆○

کچھ دنوں بعد مسٹر ہملٹن کمشنر بن کر آگرہ چلے گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی اسے بھی آگرے بلالیا۔ کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کا عہدہ خالی ہوا تھا، اس پر مقرر کردیا۔

سید احمد نے بہت جلد اپنی ذہانت اور محنت سے قوانین مال سے واقفیت حاصل کرلی۔

اس وقت کمشنری آگرہ کے تحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا۔ سید احمد نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔ یہ ایک ایسا جدید طریقہ تھا کہ سید احمد کی ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی۔

اسی زمانے میں اس نے سنا کہ بہادر شاہ ظفر کے حکم پر اسد اللہ خاں غالب مغلیہ خاندان کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ وہ گھر سے دور تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ اس اطلاع سے اسے بھی تحریک ملی۔ اس نے بھی فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ مرتب کی اور اس کا نام "جامِ جم" رکھا۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصراً سترہ سترہ خانوں میں قلم بند کیا تھا۔

عیش پرستی کا چٹخارا ابھی دل سے نکلا نہیں تھا۔ دلی میں

سُنے ہوئے راگوں کے بول ابھی تک کانوں میں گونج رہے تھے۔ اتفاق سے آگرہ میں ایسے لوگ مل بھی گئے جو اس کے ہم خیال تھے۔ منشی امیرعلی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدے داروں سے اس کی ملاقاتیں رہنے لگیں۔ یہ سب لوگ بھی موسیقی کی مدھر تانوں کے رسیا اور بے فکری کے ساتھ، ہنسی خوشی میں زندگی گزارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتمادالدولہ اور نورافشاں میں آئے دن عیش ونشاط کے جلسے ہوتے تھے۔ سید احمد کے لیے آگرہ بھی دلی بن گیا۔

اس کی کتاب "جام جم" ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوچکی تھی۔ اس کے کام، انگریزوں سے اس کی رغبت اور وفاداری اور کام کی اہلیت کو دیکھتے ہوئے صاحب کمشنر نے اس کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو، سید احمد کو وہاں مقرر کردیا جائے۔ لیکن ابھی اس حکم پر عمل ہونے نہیں پایا تھا کہ عہدۂ منصفی کے لیے قواعد امتحانی جاری ہوگئے۔ صاحب کمشنر نے اسے امتحان میں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اس نے تیاری کی اور امتحان میں بیٹھ گیا۔ پہلی ہی بار امتحان میں بیٹھ کر کامیابی حاصل کرلی اور ڈپلوما حاصل کیا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور چوبیس دسمبر کو وہ صرف چوبیس سال کی عمر میں مین پوری کا منصف مقرر ہوگیا۔

ایک سال بعد ۱۸۴۲ء میں اس کا تبادلہ فتح پور سیکری ہوگیا۔

دلی گئے بہت دن ہوگئے تھے۔ اس نے سوچا فتح پور جانے سے پہلے دلی کے دوستوں سے مل آئے۔

غالب سے تو خیر اسے چچا، بھتیجوں والی محبت کا دعویٰ تھا لیکن انہی کے توسط سے حکیم احسن اللہ خاں سے بھی اس کا محبت اور عقیدت کا رشتہ تھا۔ اسی رشتے کے تحت وہ ان سے بھی ملاقات کو گیا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ان دنوں بہادر شاہ ظفر کی نیابت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دلی کے شرفا کو قلعے تک پہنچا کر ان کی پریشانیوں کو دور کریں۔ غالب کو بھی قلعے تک پہنچانے والے یہی تھے۔

انہوں نے سید احمد کو بھی ترغیب دلائی "قلیل تنخواہ پر کیوں انگریزوں کی خدمت کرتے پھر رہے ہو۔"

"وقت کا یہی تقاضا ہے حکیم صاحب!"

"وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم بجھتی ہوئی شمع کی حفاظت کریں۔"

"جس نے ہوا کو دوست بنالیا ہو، اس شمع کی حفاظت کون کرسکتا ہے۔ بادشاہ تو خود کسی کا نوکر ہے، اس کی نوکری کیا کرنا۔"

"اس مرے گرے وقت میں بھی تمہیں تمہاری تنخواہ سے دوگنا، قلعے سے مل سکتا ہے۔"

"مجھے یوں لگے گا جیسے بادشاہ اپنا تن پیٹ کاٹ کر مجھے تنخواہ دے رہا ہے۔"

"اس کے باوجود تم نہیں سمجھتے کہ انگریز زیادتی پر ہیں۔"

"وہ ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔ ہماری بھلائی چاہتی ہے لیکن ہم ایسے سوئے ہیں کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"انہیں بادشاہ کا وجود اچھا ہی نہیں لگتا۔"

"اگر ہم نے اپنی کمزوریوں پر قابو نہیں پایا تو انہیں یہ وجود واقعی اچھا نہیں لگے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو قصور انگریزوں کا نہیں ہوگا۔"

"آپ تو اچھے خاصے انگریز ہوکر لوٹے ہیں مین پوری سے۔"

"میرا خدا جانتا ہے کہ میں انگریزوں کو پسند نہیں کرتا لیکن ان کے کارآمد اصولوں سے انحراف کیسے کرسکتا ہوں۔ وہ ایک تعقل پسند قوم ہے جبکہ ہم ضعیف الاعتقادیوں کے مارے ہوئے۔ حکیم صاحب، دنیا کو صرف قلعے تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں اگر انگریزوں کا زور توڑنا ہے تو ان جیسا بن کر دکھانا چاہیے۔"

"ہاں بھائی، تم ٹھیک کہتے ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ آثار اچھے نہیں۔"

حکیم احسن اللہ خاں اسے قلعے کی ملازمت پر تو مجبور نہ کرسکے لیکن بادشاہ سے ملاقات پر وہ تیار ہوگیا۔

"باادب... روبرو... قبلہ عالم وعالمیاں۔"

نقیب کی آواز کے کڑکے کے ساتھ وہ کورنش بجالایا۔ بہادر شاہ ظفر مرصع کرسی پر متمکن تھے کیونکہ تختِ طاؤس پر بیٹھنے کی ممانعت ہوچکی تھی۔ انگریزوں کو یہ کروفر کہاں گوارا ہوسکتا تھا۔

حکیم احسن اللہ خاں نے سفارش کی تھی کہ سید احمد کے دادا کا خطاب سید احمد کو ملنا چاہیے۔ اگرچہ اس کے دادا کا خطاب صرف جوادالدولہ تھا اور اسی خطاب کی احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی تھی مگر بادشاہ نے اس میں عارف جنگ کا اضافہ کرکے جوادالدولہ سید احمد خاں عارف

جنگ کا خطاب عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسبِ قاعدہ ادا کی گئیں۔
چھٹیاں گزارنے کے بعد وہ فتح پور سیکری روانہ ہوگیا۔ یہ شہر کبھی شہنشاہ اکبر کا دارالسلطنت رہا تھا۔ فتح پور میں جہاں اکبر کی خواب گاہ تھی، حسنِ اتفاق سے وہی عالی شان مکان اسے رہنے کے لیے ملا۔
اُردو زبان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ایسے واقعات بھی رونما ہورہے تھے جو اردو کی ترقی میں معاون ثابت ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت انگریزوں نے اردو حروف کا لوہے کا چھاپا، اردو داں طبقے سے روشناس کرادیا تھا۔ ملک میں جابہ جا چھاپے خانے قائم ہوگئے تھے۔ اردو کو عدالتی اور دفتری زبان قرار دے دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اُردو سیکھنے اور اردو میں کتابیں لکھنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ اس ترقی سے سید احمد کو بھی تحریک ہوئی۔ اس نے تین مختصر مذہبی رسائل تصنیف کئے اور انہیں طبع کرا کے اپنا نام مصنفین میں شامل کرالیا۔
ان رسائل میں کوئی خاص بات نہیں تھی بجز اس کے کہ سید احمد کی روشن خیالی اور راست گوئی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے ان رسائل میں ان عقائد کا ذکر کیا تھا جو مذہب سے ناواقفیت کی وجہ سے عام مسلمانوں میں رائج تھے اور شریعت سے ان کا واسطہ نہیں تھا۔
فتح پور میں ملازمت کرتے ہوئے اسے چار سال ہوئے تھے کہ بڑے بھائی سید محمد کی علالت کی خبر آئی۔ وہ چھٹی لے کر دلی چلا آیا۔
وہ تو معمولی بیماری سمجھے ہوئے تھا لیکن دلی پہنچا تو بھائی کی حالتِ غیر دیکھی۔
وہ ابھی تیمارداری کا حق بھی ادا نہیں کرسکا تھا کہ سید محمد کا عین عالم شباب میں انتقال ہوگیا۔
دونوں بھائیوں میں ایسی انسیت تھی کہ شہرِ دہلی میں اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ سید محمد کا قول تھا کہ کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو۔ اگر سید احمد وہاں نہ ہو تو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہی حال سید احمد کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔
ایسے بھائی نے مجلس کیا دنیا ہی چھوڑدی۔ بھائی کے مرتے ہی اس کا دل رنگین صحبتوں سے اچاٹ ہوگیا۔ لباس اور وضع قطع جو بانک پن سمجھی جاتی تھی، ترک کردیے۔ سر گھٹوالیا، داڑھی چھوڑدی۔ پائنچے متشرع کرلیے، کرتہ پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت جاتی رہی اور روز بروز مولویت کا رنگ مقدس چڑھنے لگا۔
بھائی کے مرنے کا غم صرف اسی کو نہیں تھا۔ صرف اس سے اس کا بھائی نہیں چھنا تھا، ایک ماں سے اس کا بیٹا بھی تو جدا ہوگیا تھا۔ اس کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گزرا تھا۔ اب اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ ماں سے دور فتح پور سیکری میں رہے۔ بڑے بھائی کے اٹھ جانے کے بعد ضروری ہوگیا تھا کہ وہ ماں کا سہارا بن کر ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس نے درخواست دے کر اپنی بدلی فتح پور سے دہلی کرالی۔ اس وقت وہ اپنی عمر کی انتیس منزلیں طے کرچکا تھا۔
اب وہ ان رنگین محفلوں سے تائب ہوچکا تھا جو کبھی وقت گزاری کے لیے ہوا کرتی تھیں۔ طبیعت کی جولانیاں بھائی کی موت کے ساتھ رخصت ہوچکی تھیں۔ وقت گزرا تو وقت گزرنے کا پچھتاوا بھی ہونے لگا۔ یہ احساس شدت سے ہوتا تھا کہ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ نوجوانی کی بے قراری نے کسی کتاب کو ختم ہونے ہی نہیں دیا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ جو وقت گزر گیا اسے تو واپس نہیں لایا جاسکتا لیکن جو وقت گزرنے والا ہے اس کا تو صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وقت بھی گزرے گا اور کچھ حاصل بھی ہوگا۔ اس خیال کے راسخ ہوتے ہی وہ مولوی نوازش علی کی خدمت میں پہنچ گیا جو دلی کے مشہور واعظ تھے اور درسی کتابیں پڑھانے میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔
پچھتائے ہوئے آدمی کا شوق بے مثال ہوتا ہے۔ یہی اس کے ساتھ ہوا۔ جو کتابیں ابتدا میں نہایت بے توجہی سے پڑھی تھیں، انہیں از سرِنو پڑھا اور ذہن نشین کیا۔ اس کے بعد ان سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔
اس کے بعد تو جیسے دریا اپنے ساحل کو ڈھونڈتا ہی پھرا۔ مولوی نوازش علی کے پاس سے اٹھا تو مولوی فیض الحسن کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں کی تعلیم ختم ہوئی تو مولانا مخصوص اللہ سے حدیث پڑھنی شروع کردی۔ مشکوٰۃ شریف اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔
سلطنتِ دہلی اس وقت جتنی کمزور تھی، علوم وفنون کی اتنی ہی گرم بازاری تھی۔ غالب، مومن، داغ، فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، حکیم احسن اللہ وغیرہ مجلسی زندگی کے رکنِ خاص بنے ہوئے تھے۔ اتنی تیز روشنیوں میں اپنی روشنی کا احساس دلانا مذاق نہیں تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اب وہ نہ امیر رہا تھا نہ امیرزادہ۔

بڑے بھائی کا انتقال ہوچکا تھا جس سے سو روپے کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ اس کی تنخواہ کے سو روپے ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ۔

امام بخش صہبائی کو قدیم انداز کی مرصع نثر لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اس وقت تک یہی اندازِ تحریر سید احمد کو بھی پسند تھا کیونکہ یہ نثر فارسی کی رنگین عبارت آرائی سے بہت قریب تھی۔ اس نثر کی شان و شوکت، امیرانہ مزاج سے میل کھاتی تھی۔ عوام کی بولی ٹھولی کا اس میں دخل نہیں تھا۔ اس پسندیدگی کی وجہ سے صہبائی سے اس کی ملاقاتیں روز ہونے لگی تھیں۔

○☆○

سید احمد کوچۂ چیلاں میں واقع امام بخش صہبائی کے دیوان خانے میں بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ ملازمہ نے دیوان خانہ کھول دیا تھا۔

تنہائی میں خیالات نے یورش کی۔ اس نے دیوان خانے کی چھت کی طرف دیکھا۔ پھر دیواروں کو گھورنے لگا۔ سلیقے سے جمی ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ آج یہ مکان ہے کل نہیں رہے گا۔ ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ ہندوستان کے حالات ان دنوں جو رخ اختیار کر رہے تھے، یہ بعید نہیں کہ آج کی یادگاریں، کل فراموش ہوجائیں۔ کچھ دنوں میں وہ لوگ بھی نہیں رہیں گے جو یہ بتا سکیں کہ اس گلزار میں کیسے کیسے پھول کھلا کرتے تھے۔

اس کے خیالات دیوان خانے سے نکل کر دہلی کی کئی تاریخی عمارتوں کی طرف ملتفت ہونے لگے۔ یہ عمارتیں اب کھنڈروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ کچھ دن گزریں گے کہ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا ہوگا۔ کیوں نہ ان عمارتوں کو تحریر میں محفوظ کرلیا جائے۔ عمارتیں مٹ جاتی ہیں، کتابیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

ابھی اس کا ذہن عمارتوں سے نکل کر دیوان خانے میں واپس نہیں آیا تھا کہ مولوی امام بخش صہبائی آگئے۔ وہ انہیں کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ گندم گوں رنگ، منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ۔ سر پر پٹے، دُبلا پتلا جسم۔ بر کا سفید پاجاما، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ۔ سر پر سفید صافہ بندھا ہوا۔ یہ شخص فارسی اور عربی کا کیسا بے بدل عالم ہے۔ جب یہ جمی ہوئی محفل منتشر ہوگی تو اس کے بارے میں کون جانتا ہوگا۔ ایسے کتنے عالم ہیں جن سے اس وقت بھی دہلی خالی نہیں۔ کیا یہ صورتیں اس قابل ہیں کہ یکسر فراموش کردی جائیں۔ ہمارے پاس کچھ نہ ہو، یہ فخر تو ہو کہ ہمارے پاس کچھ تھا۔ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں عمارتوں کے ساتھ ساتھ نادرِ روزگار اشخاص کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

صہبائی اس کی محویت کو اشتیاق سے دیکھ رہے تھے مگر حیران بھی تھے۔

"صدر امین صاحب! خیریت ہے، آج ہماری صورت میں آپ کو کیا نظر آگیا؟"

"یونہی، بس کچھ خیال سا آگیا تھا۔"

"ارے! آپ تو آبدیدہ ہیں۔ آپ کو ہماری قسم کچھ بتایئے ضرور، ماجرا کیا ہے؟"

سید احمد نے اپنی ذہنی کیفیت سے انہیں آگاہ کردیا۔ اس ارادے کا بھی اظہار کردیا کہ انہوں نے ابھی ابھی ایک کتاب لکھنے کا تہیہ بھی کرلیا ہے۔ اسے شائع کرایا جائے تو آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا اور تاریخ بھی قلم بند ہوجائے گی۔

صہبائی نے اس خیال کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اس کی افادیت پر اچھی خاصی تقریر بھی کی البتہ انہوں نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ نہایت محنت طلب کام ہے۔

سید احمد نے جب دوسرے دوستوں سے اپنی اس تصنیف کا ذکر کیا تو انہوں نے کسی رئیس زادے کا شوق سمجھ کر سنا لیکن وہ اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا تھا، جتنا اب تھا۔

اس نے ایک ملزم کے ساتھ اس کام کو ہاتھ میں لیا اور دہلی کی عمارتوں کی تحقیق میں منہمک ہوگیا۔ یہ عمارتیں شہر سے باہر تھیں۔ تعطیل کے دنوں میں وہ ہم خیال دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر چلا جاتا۔ امام بخش صہبائی ہمیشہ ساتھ ہوتے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھیں۔ اکثر کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہوتے تھے۔ کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کب بنی تھی اور کیوں بنائی گئی تھی؟ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے ہوئے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ پھر ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش۔ کتبوں کے چربے اتارنا اور ہر کتبے کو اس کے اصلی خط میں دکھانا۔ ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھنچوانا۔ یہ ایسے کام تھے، پتا پانی ہوتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو راستے سے لوٹ آتا لیکن اس کے دوستوں پر یہ پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ اس میں تحقیق کرنے اور پہاڑوں کو پانی کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے زیادہ بلند ہونے

کے سبب پڑھے نہیں جاسکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ کوئی اس بلندی پر چڑھے۔ یہ کام مزدوروں سے لیا نہیں جاسکتا تھا۔ سید احمد نے کہا' وہ خود اوپر چڑھیں گے۔ دوستوں نے ہر طرح سمجھایا کہ کسی تصنیف کے لیے جان کو خطرے میں ڈالنا کہاں کی دانش مندی ہے لیکن اس کی ضد نے سب کو زیر کردیا۔

اس نے مزدوروں کو بلاکر لکڑی کی دو بلیاں' مینار کے ساتھ ساتھ زمین میں گڑوائیں اور ایک ایک چھینکا ہر کتبے کے متوازی بندھوالیا۔ کسی اور کی ہمت نہیں تھی جو اس کے ساتھ اوپر چڑھتا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور اوپر چڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ اوپر چڑھتا جاتا تھا' دوستوں کے چہروں کا رنگ اڑتا جاتا تھا۔ مولانا صہبائی نے گھبرا کر عربی کا ایک شعر پڑھا "وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان پر کچھ کام ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ وہ آسمان پر ہی چڑھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیچے سے دیکھنے والوں کو تارے کی طرح نظر آنے لگا۔

کئی دن کی محنت اور خطروں سے کھیلنے کے بعد اس نے یہ کام بھی مکمل کرلیا۔

باوجود اس قدر مشکلات کے اس نے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ڈیڑھ برس کے اندر اندر اسے کتابی صورت میں "آثار الصنادید" کے نام سے چھاپ دیا۔

اس کے پہلے باب میں ۱۳۰ عمارتوں کا بیان تھا۔ ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اس کے ساتھ دیا تھا۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان تھا۔ تیسرے باب میں تقریباً ستر حویلیوں' مندروں' مسجدوں' باؤلیوں اور کنوؤں کا بیان کیا گیا تھا۔ پھر مشاہیر دہلی کا تذکرہ کیا تھا۔

مولانا صہبائی سے دن رات کی صحبت تھی لہٰذا ان کے اثر سے اس کتاب کا اسلوب بیان فارسی زدہ تھا۔ نہایت مشکل انداز تحریر اختیار کیا گیا تھا لیکن مضمون کے اعتبار سے نہایت عبرت خیز تھی۔ سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی تھی۔ آخری باب پڑھ کر دلی کے آخری دور کی شمع آنکھوں کے سامنے اجالا کرنے لگتی تھی۔

۱۸۴۷ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی۔ مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں آباد' ولایت جانے والے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں جاکر اسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کے ممبروں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوجائے تو بہت بہتر ہے۔

رابرٹس جب ولایت سے واپس آئے تو انہوں نے چاہا کہ اس کے ساتھ مل کر ترجمہ کیا جائے۔ ان دونوں نے مل کر یہ کام شروع بھی کردیا تھا لیکن اسی دوران میں رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہوگئی اور یہ کام رک گیا۔

آثار الصنادید لکھنے کے بعد اسے اپنے قلم پر بھروسا ہوگیا تھا۔ یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ اس ناپائدار دور میں اگر کوئی چیز ہمیں زندہ رکھ سکتی ہے تو وہ ہمارے کارنامے ہیں۔ ان کارناموں میں سب سے بہتر کارنامہ کتابوں کی تصنیف ہے جو مصنف کو زندہ بھی رکھتی ہے اور خلق خدا کو فائدہ بھی پہنچاتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انگریز عہدے دار اسے خاص عزت دینے لگے تھے۔ یہ پذیرائی اس کے لیے حوصلہ افزا ہوئی۔ کئی چھوٹے چھوٹے رسائل اس نے تصنیف کیے لیکن بڑا کام اس کا وہی تھا جو اس نے آثار الصنادید کے نام سے شائع کرایا تھا۔

ایک روز وہ مسٹر ایڈورڈ طامس' سیشن جج کے بنگلے پر ان سے ملنے گیا ہوا تھا کہ دوران گفتگو آثار الصنادید کا ذکر نکل آیا۔ مسٹر طامس کو خود بھی پرانی چیزوں کی تحقیق کا نہایت شوق تھا اس لیے اس کتاب کو انہوں نے خوب اچھی طرح پڑھا تھا۔

"مسٹر احمد' کتاب تو بہت اچھی ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسا آدمی بھی ایسی عبارت کو پسند کرسکتا ہے۔ اب اس کو سمجھنے والے کتنے رہ گئے ہیں۔ وقت کے ساتھ فارسی کا زور ٹوٹتا جائے گا" مسٹر طامس نے کہا۔

"فارسی کی ضرورت تو رہے گی مسٹر طامس!"

"ہم انگریز تو آپ کی بھلائی کے لیے اردو کو آگے لانا چاہتے ہیں اور آپ فارسی کا دم بھرتے ہیں۔"

"لیکن لوگ اسی عبارت کو پسند کرتے ہیں۔"

"جس چیز کا نمونہ ان کے پاس ہے ہی نہیں' اسے وہ پسند کیسے کریں۔ یہ بھی تو سوچیے' آپ جیسے وفاداروں سے تو ہمیں یہ امید کہ آپ فورٹ ولیم کالج کے منصوبے میں ہاتھ بٹائیں گے۔ آسان اردو میں لکھیں گے۔"

"میں تو اب لکھ چکا۔"

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اسے از سر نو مرتب کریں اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کریں تاکہ آپ کے انگریز دوست بھی اسے پڑھ سکیں" مسٹر طامس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے' آپ جو بات کرتے ہیں اس کی کوئی نہ

کوئی عقلی بنیاد ضرور ہوتی ہے۔ میں اس کو از سرِ نو مرتب کروں گا۔"

"تھینک یو فار دس فیور، مسٹر احمد!"

سید احمد نے ان کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا۔ عبارت کو جس قدر ہو سکا، سادگی سے قریب کیا۔ ایشیائی مبالغوں اور تکلفات کو ٹکسال باہر کیا۔ نقشے بھی از سرِ نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے۔

○☆○

سیاستِ ہند میں انگریزوں کا عمل دخل اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان کی زیادتیوں کی باتیں گھروں میں ہونے لگی تھیں۔ کوئی انہیں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے چند کوششیں قرار دیتا تھا تو کوئی اسے ان کی زبردستی کہتا تھا۔

نیپال سے لے کر سندھ تک اور بنگال سے پنجاب تک کا علاقہ یا تو انگریزی عمل داری میں ہو چکا تھا یا ان کی نگرانی میں آ چکا تھا۔ وہ اب اپنے مقبوضات میں تیزی سے اضافہ کر رہے تھے۔ چھوٹی موٹی ریاستیں پہلے ہی انگریزوں کی چٹکی میں دب چکی تھیں۔ اس کے بعد مختلف بہانوں سے ستارہ، اجیت پور، سنبھل پور، جھانسی اور ناگپور جیسی ہندو ریاستیں یکے بعد دیگرے الحاق کر لی گئیں۔ بڑی بڑی ریاستوں میں ان کی حفاظت کے لیے، دوست بن کر اپنی فوجیں وہاں پہنچادی تھیں جن سے ان کے عزائم ظاہر ہو رہے تھے۔ سوچنے والوں کے کلیجے دہل رہے تھے۔

نواب کرناٹک کے حقوق سلب کر لیے گئے۔ برار کو قرضے کے بوجھ تلے داب کر پٹے پر حاصل کر لیا۔ ان کارستانیوں کا مقصد مرکز کو کمزور کرنے کے سوا کچھ نہ تھا تا کہ بعد میں اسے بھی تر نوالہ بنا لیا جائے۔

ریاستوں کے الحاق کے بعد جاگیروں پر بھی قبضے شروع ہو گئے تھے جن سے عام معاشی انتشار پیدا ہونے لگا تھا۔

ایک اور نہایت دور رس تبدیلی تعلیمی صورت میں نمودار ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دل جوئی کے لیے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح عوام کا اعتماد بھی بحال ہوگا اور انگریزوں کے لیے سستی اُجرت پر کام کرنے والے بھی مل جائیں گے۔ مزید یہ کہ ان میں نظریاتی تبدیلی آئے گی۔ یہ تعلیم یافتہ انگریزی حکومت کے وفادار رہیں گے۔

انگریزی حکومت کے لیے "موزوں ہندوستانی" بنانے کے لیے عیسائی مشنریوں نے تعلیم و تدریس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دور دراز کے اضلاع میں لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعلیم کے نام پر عیسائیت کا پرچار شروع کر دیا گیا۔ کم عمر طالب علموں سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دلانے والا کون ہے؟ جو لڑکے عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے، انہیں انعام دیا جاتا تھا۔

مذہب کی بندشوں کو ڈھیلا کرنا اور عیسائیت کی تبلیغ کرنا انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا حصہ بن گیا تھا۔ دور دراز کے دیہات میں عیسائی پادری کھلے عام اپنے دین کی تبلیغ کرتے پھر رہے تھے۔

فارسی کی جگہ اردو کو آگے بڑھانے کے پیچھے بھی مرکزیت کا خاتمہ اور ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ ڈالنا تھا۔ ۱۸۴۴ء میں واضح اعلان کر دیا کہ آئندہ سرکاری نوکری کے وہ حق دار ہوں گے جو انگریزی جانتے ہوں گے۔ اس اعلان کے بعد لوگوں کو یقین آ گیا کہ انگریزوں نے یہ پکا ارادہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کو زبردستی مشنریوں کے اسکولوں میں بھیجا جائے اور بچوں کو عیسائی بنایا جائے۔

ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافی اور بدسلوکی کے واقعات بھی عام ہوتے جا رہے تھے۔ ایک جرم جو کسی ہندوستانی سے سرزد ہوتا، اس کی سزا کچھ اور ہوتی، وہی جرم کسی انگریز سے سرزد ہوتا تو سزا کچھ اور ہوتی۔

دیسی سپاہیوں کے ساتھ بھی انگریزوں کا برتاؤ سفاکانہ، ظالمانہ اور اہانت آمیز تھا۔ گورے سپاہیوں پر تو روپیا پانی کی طرح بہایا جاتا تھا لیکن دیسی سپاہیوں کے جائز مطالبات بھی پورے نہیں کیے جاتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا کورٹ مارشل کیا جاتا تھا۔

عیسائی پادری قریب قریب ہر بڑے شہر اور ضلع میں پھیل گئے تھے۔ جگہ جگہ گرجا، وعظ خانے، مدرسے تعمیر ہو رہے تھے جس سے شکوک و شبہات بڑھنے لگے تھے۔ مسلمان واعظوں کی طرف اس کے دفاع کے لیے پمفلٹ لکھے جا رہے تھے، تقریریں ہو رہی تھیں۔ ان کوششوں سے مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات جوان ہونے لگے تھے۔

○☆○

مسٹر طامس، دلی سے جا چکے تھے لیکن سید احمد کو نہیں بھولے تھے چنانچہ جب وہ آگرہ گئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے بورڈ گئے تو بجنور کی صدر امینی کے لیے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ مسٹر طامس نے فہرست اٹھا کر پڑھنی شروع کر دی۔ انہیں سید احمد کے نام کی تلاش تھی لیکن فہرست میں یہ نام نہیں تھا۔

"اس میں سید احمد کا نام نہیں ہے؟"

"وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے اس لیے ان کا نام خارج کردیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ کئی مرتبہ انکار کرچکے ہیں" بورڈ کے ممبروں نے کہا۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ قدیم عمارتوں کی تحقیق میں مصروف تھے۔ اب ان کا کام ختم ہوچکا ہے۔ اب انہیں دلی سے باہر جانے پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

انہوں نے سرسید کو خط لکھا کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہوگئی ہے۔ ہرگز انکار نہ کرنا۔

طامس کا خط ملنے کے بعد بورڈ کی جانب سے بھی اطلاع آگئی چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہوکر دلی سے بجنور چلا گیا۔

لکھنے کی چاٹ تو پڑ ہی چکی تھی۔ بجنور پہنچ کر اس نے اپنے لیے ایک ایسا کام نکال ہی لیا۔

ایک سرکلر محکمۂ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا کہ جس ضلعے کا بندوبست ختم ہوجائے اس ضلعے کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔

صاحب کلکٹر نے سید احمد سے ذکر کیا۔ اس نے کہا' اس ضلعے کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر بہت خوش ہوئے اور محکمۂ بندوبست میں حکم بھیج دیا کہ جس پرگنہ یا گاؤں کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً ان کے پاس بھیج دیے جائیں۔

سید احمد نے یہ تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور محنت سے لکھی۔

جب تاریخ مکمل ہوگئی تو کلکٹر نے اسے ملاحظے کے لیے صدر بورڈ کے پاس بھیج دیا۔

ابھی یہ تصنیف بورڈ سے واپس نہیں آئی تھی کہ بغاوت کی خبر آگئی۔

○☆○

سپاہ ہندوستان کو انگریزوں سے سنگین اور شدید اختلافات تھے۔ انہیں یقین تھا کہ انگریز انہی کے بل بوتے پر حکومت کررہے ہیں پھر بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں ذلیل کرتے ہیں اور ان کی توہین کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہیں قابو میں کرنے کے لیے دباکر رکھنا چاہتے ہیں۔

ان سپاہیوں کو اپنی ذلت تو گوارا تھی لیکن جب چربی والے کارتوس متعارف کرائے گئے تو انہیں یقین آگیا کہ انگریز انہیں بے دین بنانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ ان کارتوسوں کو منہ سے چھیلنا پڑتا تھا اور ان کے متعلق یہ مشہور ہوگیا تھا کہ ان میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔

۶ مئی ۱۸۵۷ء کی ایک چمکیلی صبح تھی کہ میرٹھ کے فوجی افسروں نے حکم دیا کہ دیسی سپاہی چربی والے کارتوس استعمال کریں۔ پچاس سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو چھونے سے بھی انکار کردیا۔

جن سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا' ان کے خلاف فوجی قانون حرکت میں آگیا۔

۹ مئی ۱۸۵۷ء کو کورٹ مارشل کی تعمیل ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ اور یورپین جمع ہوئے۔ پچاسی مجرم سوار حوالات سے بلائے گئے۔ وہ اپنی وردی پہنے ہوئے اب بھی سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ اول سزا حکم پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر تمام کی وردیاں اتارلی گئیں۔ پھر لوہار اپنے اوزار اور بیڑیاں لے کر آئے اور پچاسی ہندوستانی سپاہیوں کے پیروں میں بیڑیاں ان کے دوسرے ہندوستانی ساتھیوں کے روبرو پہنادیں جس سے ان کی بے عزتی کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔

قیدی اپنے ہاتھوں کو اٹھاکر جرنیل کے آگے گڑگڑاتے تھے کہ وہ اس طرح انہیں ذلیل وخوار نہ کرے۔ جب قیدیوں کو بالکل مایوسی ہوئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ملامت کرنی شروع کی۔ اس وقت گورے سپاہیوں کے ہتھیار چمک رہے تھے اس لیے خوف کے مارے کوئی کچھ نہ بول سکا۔

سرسید کی ایک تحریر

"میں اپنی قوم کو آسمان کی ماخذ کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصے کی جو نیلا نیلا سیاہ رو ڈراونا دکھائی دیتا ہے' کچھ بھی پروا نہیں کرتا مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کیے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہیں جیسے آسمان پر تارے' اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو۔"

قیدی جیل خانے پہنچا دیے گئے اور دوسرے سپاہی اپنی لینوں میں چلے گئے لیکن نہایت غم زدہ اور غصے میں بھرے ہوئے۔ ہر ایک زبان پر یہ سرگوشی تھی کہ خدمت کا یہ صلہ ہے تو کل ہمارے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

میرٹھ کے بازاروں میں یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ یورپین، میگزینوں پر قبضہ کرنے کو ہیں۔ دو ہزار بیڑیاں تیار ہو گئی ہیں۔ جو کچھ ہوا وہ تو تجربہ تھا۔ اب باقی سپاہیوں کو بھی بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔

دوپہر نہیں گزری تھی کہ دیواروں پر اشتہار لگ گئے کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے لوگ تیار ہو جائیں۔ یہ اشتہار انگریزوں نے بھی پڑھے۔ غصہ سب کو آیا، یقین کسی کو نہیں آتا تھا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ مئی کے مہینے کا گرم سورج نمودار ہوا۔ انگریز اپنے گرجا میں عبادت کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن ماحول ایسا تھا جیسے آسمان سے کوئی بلا نازل ہونے کو ہے۔ بارکوں سے ہندوستانی نوکر بھاگے جاتے تھے۔ افسروں کے بنگلوں پر بھی نوکر غیر حاضر ہوتے جاتے تھے۔

دوپہر کے بعد ہندوستانی سپاہیوں کو بارکوں میں اور صدر بازار میں اردگرد کے دیہات میں شورو شر کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ شہری مسلح ہو رہے تھے۔ کوئی انگریزوں سے نفرت رکھتا تھا، کوئی انتقام لینا چاہتا تھا۔ کوئی مذہبی جوش میں بھرا تھا، کوئی لوٹ مار کا بھوکا تھا۔

جب آفتاب غروب ہوا تو طوفان اٹھا۔ بندوقوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر طرف دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔

ہندوستانی رجمنٹ غصے سے بھری ہوئی باہر نکلی۔ کرنل فن ٹس صاحب نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن مارے گئے۔ ذرا سی دیر میں رجمنٹوں نے افسروں کے بنگلوں پر جمع ہو کر انہیں آگ لگا دی۔ افسروں کو مارا، ان کے بیوی بچوں کو قتل کیا۔ شہر کے نواح سے آدمی ایسے دوڑے چلے آتے تھے جیسے اپنے بھٹوں سے درندے نکلتے ہیں۔

اب سپاہیوں کو اپنی پڑی۔ اب وہ قتل و غارت گری اور آتش زنی کے مجرم بن گئے تھے۔ جانتے تھے کہ اگر میرٹھ میں رہے تو سزا کے مستحق ہوں گے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ دہلی چلو چنانچہ وہ گئے اور اپنے پیچھے اپنے افسروں کے گھروں کی خاک اور انگریزوں کی لاشوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔

پیر کے روز ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں حسب دستور کچہریاں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں باغیوں کی آمد آمد کی خبر مشہور ہوئی۔ جتنی دیر میں انتظامات ہوتے، ایک بلوا شہر میں برپا ہو گیا۔ کشمیری دروازہ خون میں نہا گیا۔ دریا گنج میں جہاں ایک بڑی جماعت پنشن دار عیسائیوں اور صاحبان میگزین بیوہ بچوں کے رہتی تھی، سب قتل ہو گئے۔ چھاؤنی میں جتنی پلیٹیں تھیں، ایک نے بھی انگریزوں کی حمایت میں بندوق نہیں چلائی۔ شہر کے ایک سرے سے باغی داخل ہو رہے تھے دوسرے سرے پر کمشنر فریزر، ہندوستانی سپاہیوں کو خیر خواہی کے لیے بلا رہے تھے۔ مایوس ہو کر انہوں نے فرار کی راہ پکڑی۔ اپنی بگھی میں بیٹھے اور قلعے کے دروازے کی طرف بھاگے۔ قلعے پہنچتے ہی ایک اردلی کی تلوار نے ان کا کام تمام کر دیا۔

جتنے بڑے انگریز افسران شہر میں تھے، قتل ہوئے یا فرار ہو گئے۔ سارے شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ آسمان پر دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سارے بنگلے آگ کا گولا بنے ہوئے تھے۔ ایک قیامت تھی جو انگریزوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

سید احمد کی دلی لوٹی جا رہی تھی اور وہ اس میدان کارزار سے دور بجنور میں صدر امینی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ گیارھویں مئی تک تو اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اس کے وطن پر کیا گزر رہی ہے لیکن بارھویں تاریخ کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی اور پے درپے اس کے آثار بھی نمودار ہوتے گئے یعنی کنارہ گنگا تک راہ لٹنے لگی اور مسافروں کی آمدورفت بند ہو گئی۔ بارھویں اور تیرھویں کو جو مسافر میرٹھ کو جاتے تھے راہ سے لوٹ آئے۔ آس پاس کے علاقوں میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن بجنور میں ابھی غدر نہیں ہوا تھا۔

غدر کی خبر سنتے ہی اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ کیا خبر دہلی میں اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہو اور سب کس حال میں ہوں۔ پھر اس خیال سے دل کو تسلی بھی ہو گئی کہ باغیوں سے اگر خطرہ ہو گا تو انگریزوں کو ہو گا۔ ہندوستانیوں کو نہیں۔ اللہ نے چاہا تو اس کا گھر ان آفات سے محفوظ ہو گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے ان انگریز عورتوں اور بچوں کا خیال آیا جو بجنور میں مقیم تھے۔ اگر یہاں شوریدگی بڑھی تو ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ اس خیال کی ہوا بندھتے ہی اس نے ہتھیار باندھے اور سہمی ہوئی سڑکوں سے گزرتا ہوا بجنور کے مجسٹریٹ مسٹر شیکسپیئر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

بجنور میں اس وقت بیس یورپین، عورتوں اور بچوں سمیت تھے اور یہ سب اس وقت مجسٹریٹ کی کوٹھی میں جمع ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ برا حال شیکسپیئر کی بیگم کا تھا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ سید احمد کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔

"مسٹر احمد، ادر دلی میں سب مارے گئے۔ اب یہ باغی

لوگ بجنور بھی آئے گا۔ ام کو بھی مارے گا۔ ام کو ادر سے نکال دو۔"

وہ عورت اس طرح کانپ رہی تھی جیسے یہ مئی کا نہیں دسمبر کا مہینہ ہو۔

"میم صاحب' جب تک آپ کا یہ وفادار دوست زندہ ہے' آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ میری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے' اس وقت گھبرانے میں مضائقہ نہیں۔"

"اوہ' تھینک یو آور فرینڈ! پر اب ہوئیں گا کیا۔"

"آپ تسلی رکھیں' میں مسٹر شیکسپئر کے ساتھ مل کر سب انتظام کرلوں گا۔"

"پھر بھی کوئی ادر چڑھ دوڑا تو؟"

"میں خود آپ کی کوٹھی پر پہرا دوں گا۔ آپ بے فکر ہوجائیں۔"

مسز شیکسپئر نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور سید احمد کو دعائیں دیں۔

بجنور کی حفاظت کے لیے حکومتی کوششوں کے علاوہ اپنے طور پر بھی انتظام کیا۔ ڈپٹی کلکٹر اور تحصیل دار دونوں مسلمان تھے۔ سید احمد نے حفاظتی دستوں کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ محمد رحمت اللہ ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے غول کو لے کر رات بھر گشت کرتے تھے اور سید احمد' سید تراب علی تحصیل دار کے ساتھ مل کر اندھیرے باغات جیل خانہ اور خزانے کا گشت کرتے رہے۔

حالات پُرسکون تھے لیکن ایک روز اچانک سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جارہی تھی' بجنور پہنچی۔ خبر مشہور ہوگئی کہ اس کمپنی کے تیور ٹھیک نہیں ہیں اور کچھ تلنگے مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچ بھی گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی وہ گھبرا کر ان کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر صورتِ حال معلوم ہوئی تو جان میں جان آئی لیکن یہ احساس ضرور ہوا کہ اگر کسی دن واقعی ایسا ہوگیا تو بہت برا ہوگا۔ بجنور سے زیادہ صاحب کی کوٹھی کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ اس نے اسی وقت کوٹھی کے سامنے شامیانہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گیا۔

اِدھراُدھر سے شورشوں کی خبریں آرہی تھیں۔ خبر آئی کہ مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹ گیا ہے اور قیدی اِدھراُدھر پھیل گئے ہیں اور ڈاکے ڈالتے پھررہے ہیں۔

سید احمد' ڈپٹی مجسٹریٹ اور تحصیل دار سید تراب علی' مجسٹریٹ کی کوٹھی پر بیٹھے ان اندیشوں کا اظہار کررہے تھے کہ باغی یہاں کا خزانہ لوٹنے نہ آپہنچیں۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ خزانے کو کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔

ابھی اس تجویز پر پوری طرح سوچنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک بندوقوں کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ سید احمد سمیت تمام اصحاب تلواریں اور بندوقیں لے کر جیل خانے کی طرف دوڑے۔ قریباً آدھے میل دوڑنے کے بعد خیال گزرا کہ خزانہ نہ لٹ جائے۔ سید احمد آدھے راستے سے واپس آیا اور خزانے کی حفاظت کے لیے پہرے کا بندوبست کیا۔

سپاہیوں کی بندوقوں سے چند قیدی مارے گئے جو بچے انہیں دوبارہ جیل کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس قضیے سے نمٹنے کے بعد حسبِ تجویز' سید احمد نے اپنے ہاتھ سے خزانے کے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کنوئیں میں ڈال دیے۔

ایسے ہی کسی اور واقعے سے بچنے کے لیے مسٹر شیکسپئر نے جملہ رئیسانِ ضلع کو بجنور میں طلب کیا کہ مع کمک انتظام کے لیے حاضر ہوں۔

فیضانِ سید مرحوم

اسی کی عمر بھر کی کوششوں کا ماحصل سمجھو
اثر جس عامِ بیداری کے ملت میں نمایاں ہیں
اسی کی پُراثر شیرازہ بندی کے تصدق میں
مجزا نسخۂ ملت کے اوراقِ پریشاں ہیں
حضورِ سرورِ کون ومکاں سے اس کو ترکے میں
ملا وہ دردِ مضمر' قوم کے سب جس میں درماں ہیں
جگایا اس نے ہم سوتے ہوؤں کو خوابِ غفلت سے
وہ غفلت بستیاں جس سے ہوئی قوموں کی ویراں ہیں
ریاضِ قوم کو از بسکہ سینچا اس نے اشکوں سے
بہاریں اس کی رشکِ رونقِ گلزارِ رضواں ہیں
وہ خود تو خلد میں ہے کارنامے اس کے سب لیکن
مہ و خورشید کے مانند تاباں اور درخشاں ہیں
علی گڑھ میں کیا قائم وہ دارالعلم سید نے
ثنا خواں ہیں پرائے جس کے اپنے جس پہ نازاں ہیں
(مولانا ظفر علی خاں)

○☆○

اسی روز شام کے وقت نجیب آباد سے نواب محمود خاں ساٹھ ستّر پٹھان بندوقچیوں کے ساتھ بجنور میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ساتھ چند خالی گاڑیاں بھی لایا تھا۔

بجنور آتے ہی اس نے ڈپٹی کلکٹر رحمت اللہ خاں سے ملاقات کی مگر جب اسے معلوم ہوا کہ خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا گیا ہے تو ہاتھ ملنے لگا۔

"میں تو گاڑیاں اپنے ساتھ لایا تھا۔ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ خیر دیکھا جائے گا۔"

اس رات بجنور میں بڑا اندیشہ فساد کا رہا لیکن کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور محمود خاں مراد آباد کی طرف نکل گیا۔

ان دو واقعات نے یہ تاثر پیدا کر دیا تھا کہ بجنور میں بہت بڑا بندوبست ہے اس لیے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار ہوتی رہی بجنور بچا رہا۔ دیہات البتہ لٹتے رہے۔

مئی کا مہینہ گزر چکا تھا کہ یکم جون کو محمود خاں ایک مرتبہ پھر بجنور آیا۔ اس مرتبہ بغاوت کی علامتیں اس کے چہرے سے ظاہر تھیں۔

اس مرتبہ اس کا جانا مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اسے پھر روانہ کیا گیا۔ اس مرتبہ وہ دارا نگر کی طرف نکل گیا۔

اس ایک مہینے میں بریلی، شاہ جہاں پور، پیلی بھیت اور مراد آباد سب اضلاع روہیل کھنڈ کے بگڑ چکے تھے تو بجنور کے رہنے کی کیا توقع تھی جو پہاڑ اور جنگل اور گنگا کے کھادر سے ملا ہوا ہے اور جس میں کسی طرح کا سامانِ حفاظت موجود نہیں تھا۔ تھوڑی سی فوج بھی یہاں نہیں تھی اور نہ آنے کی توقع تھی۔

سید احمد کو توقع تھی کہ انگریزی افواج بہت جلد باغیوں پر قابو پالیں گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شوریدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دہلی ابھی تک باغیوں کے قبضے میں تھا۔ جن جن اضلاع میں انگریز تھے، مارے جا رہے تھے، نکالے جا رہے تھے۔ زیادہ دیر لگ جانے کی وجہ سے جو مسلمان وفادار تھے ان کے دل بھی انگریزوں کی طرف سے ہٹتے جا رہے تھے۔

روہیل کھنڈ کے بگڑ جانے کے بعد کوئی طاقت نظر نہیں آتی تھی جو بجنور کو بچا سکے۔ غالباً محمود خاں نے بھی اس موقع کو بھانپ لیا تھا۔ وہ تیسری مرتبہ بجنور آ گیا۔ اس مرتبہ ڈھائی تین سو کی جمعیت اس کے ساتھ تھی۔ مخبری سے معلوم ہوا کہ مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس مرتبہ اس کی سرکشی اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ صاحب کلکٹر کے بلانے پر وہ ان کے سامنے حاضر نہیں ہوا۔ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ فساد شروع ہو جائے اور باغی ہم پر حملہ کریں، ہمیں کوئی تدبیر کر لینی چاہیے" صاحب کلکٹر نے سید احمد سے کہا۔

"ہم کیا تدبیر کر سکتے ہیں؟" سید احمد نے کہا "جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ ایک ایسا چوہا تک بھی ہمیں میسر نہیں آئے گا جو حکام انگریزی کی رفاقت کر کے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک انہیں پہنچا دے۔"

"پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

"عورتوں اور بچوں کو ہمیں رڑکی پہنچا دینا چاہیے۔ صرف مرد یہاں رہیں۔"

بارہ بجے رات کو یہ صلاح پکی ہو گئی اور روانگی کی تیاری بھی ہونے لگی۔

"مسٹر شیکسپیئر، میری ایک رائے اور بھی ہے" سید احمد نے کہا۔

"فرمائیے۔"

"میری رائے یہ ہے کہ اس روانگی کے لیے محمود خاں کو اعتماد میں لینا چاہیے ورنہ وہ اسے سازش سمجھے گا۔ اس کی غلط فہمی اسے کسی فساد پر نہ اکسا دے۔"

"بات تو معقول ہے مگر اس سے بات کون کرے گا؟"

"اس سے بات میں کروں گا۔ امید ہے میں اسے بے وقوف بنا لوں گا اور وہ آپ لوگوں کو یہاں سے نکلنے کی اجازت دے دے گا۔"

محمود خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ اسی کوٹھی کے احاطے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ سید احمد اسی وقت رات کو اس سے ملنے گیا۔ وہ ہیبت ناک بہادر پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے علیحدگی میں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے" سید احمد نے کہا۔

"جو کچھ کہنا ہے یہیں کہو۔"

"میں نے کہا نا، اکیلے میں کہنا ہے۔"

"ڈرتے کیوں ہو؟ یہاں کون غیر ہے۔ سب بھائی پٹھان ہیں کہو۔"

سید احمد کے اصرار پر بالآخر اسے اٹھ کر آنا پڑا "چند انگریزوں کو مار دینے سے تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔ بہتر یہ ہے کہ انہیں صحیح سالم یہاں سے جانے دو اور تم یہاں کے مالک بن جاؤ۔ جب یونہی کام نکل سکتا ہے تو فساد کرنے اور

خوں ریزی سے کیا حاصل۔"

سید احمد نے اس خوبی سے اسے نشیب و فراز سمجھائے کہ وہ پگھلنے لگا۔

"میں خود یہ نہیں چاہتا" محمود خاں نے کہا "اگر کوئی پٹھان ان انگریزوں کو مار دے تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں انہیں روک تو نہیں سکتا۔"

محمود خاں نے اس انداز سے یہ بات کہی جیسے وہ خود فساد کرنا چاہتا ہے لیکن نام اپنے ساتھیوں ..... کا لے رہا ہے۔

"اگر آپ کی اصلاح ہو تو آج ہی رات میم صاحبہ اور بچوں کو بھیج دیں۔ دو ایک روز میں کلکٹر صاحب اور مجسٹریٹ صاحب بھی چلے جائیں گے۔ اس کے بعد یہاں کا انتظام تم ہی کو کرنا ہے۔"

سید احمد نے ایسی تدبیر سے اسے شیشے میں اتارا کہ یہاں کی حکومت اسے اپنی مٹھی میں نظر آنے لگی۔

"یہ کیا مذاق ہے کہ آج میم صاحبہ جائیں اور پھر حکام جائیں۔ اگر جانا ہے تو آج ہی سب جائیں۔ اس وقت تک تو میں نے پٹھانوں کو روک روک کر رکھا ہے۔ پھر میرے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔"

"چلو، ہم اور تم چل کر جناب کلکٹر بہادر سے عرض کرتے ہیں کہ اب یہاں رہنا مناسب نہیں۔"

"میں تو نہیں جاتا" محمود خاں نے دبنگ لہجے میں کہا۔

"چاہے جائیں چاہے نہ جائیں۔"

اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی اور دوبارہ اپنے پٹھانوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

سید احمد نے اپنا مطلب نکال لیا تھا۔ اب اگر وہ جائیں گے تو محمود خاں کی اجازت سے جائیں گے اور بہ حفاظت جائیں گے۔

ہاتھی سب تیار کھڑے تھے۔ انگریز عورتیں اور بچے سوار ہو چکے تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے محمود خاں کو بلوایا گیا۔

"ہم جاتے ہیں اور ضلع تمہارے پاس چھوڑتے ہیں۔ تم بخوبی انتظام رکھو اور ہمارے اہل کاروں سے کام لو اور آرام سے رکھو" صاحب کلکٹر نے کہا۔

"زبانی میں کچھ نہیں مانتا۔ مجھے خط لکھ دو" محمود خاں نے کہا۔

صاحب کلکٹر نے حکم دیا اور سید احمد نے خط لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

انگریز سواریاں تورڑکی کی طرف روانہ ہو گئیں اور تراب علی تحصیل دار اور سید احمد کو ٹلہ جانے کے لیے بجنور سے نکلے۔

ابھی کو ٹلہ پہنچے، دو تین روز ہی ہوئے تھے اور یہ فکر کی جارہی تھی کہ اب کدھر جائیں کہ دو سوار کو ٹلہ پہنچ گئے۔ محمود خاں کی طرف سے طلبی کے احکام تھے، انکار کی جرأت کسے تھی۔ سید تراب علی نے اپنی عورتوں کو نگینہ بھیج دیا اور خود سید احمد کے ساتھ بجنور چلے آئے۔ ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے بلا لیے گئے تھے۔

نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ مجھ سے ملنے آئیں تو نذریں پیش کریں لیکن انہوں نے نذریں پیش نہیں کیں۔ نواب نے مکدر ہو کر انہیں رخصت کر دیا اور کہا جاؤ، بدستور اپنا کام کرتے رہو۔

سید احمد نے اپنا کام اسی طرح انجام دینا شروع کر دیا جس طرح انگریزی عمل داری میں ہوتا تھا۔

ایک رات محمود خاں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ اس رات گئے طلبی پر حیران تھا لیکن ان دنوں علاقے کی حالت ایسی تھی کہ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا کوئی خاص بات ہوگی۔ اپنے دل میں مشوروں کے جال بنتا ہوا وہ کلکٹر کی کوٹھی تک پہنچ گیا جہاں اب محمود خاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس وقت اس کا دستِ راست احمد اللہ خاں بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اس کے صلے میں جو جاگیر چاہو ٹھہرالو۔ ہم سے حلف لے لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے" محمود خاں نے نہایت رازداری سے کہا۔

سید احمد سر سے پاؤں تک کانپ گیا کہ اس بات کا اسے کیا جواب دے۔ اقرار میں بھی اپنا نقصان ہے انکار میں بھی۔ انگریزوں سے وفاداری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ محمود خاں کو مایوس کر دے۔

"نواب صاحب! میں اس بات پر حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیرخواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا البتہ اگر تمہارا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔"

"سید صاحب، انگریزوں کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ آپ کو یہیں رہنا ہے۔ وفاداری ایک حد تک اچھی ہوتی ہے" محمود خاں نے کہا۔

"حکام انگریزی کی عمل داری کبھی نہیں جائے گی" سید احمد نے کہا "انگریز اگر چلے بھی گئے جیسا کہ تمہارا خیال ہے

تو تم سے تمہاری نوابی کوئی نہیں چھینتا اور اگر میرا خیال سچ نکلا تو تم خیر خواہِ سرکار ہو گے اور سرکار کی طرف سے تمہاری ترقی ہو گی۔"

"ہم جو تم سے چاہتے ہیں' اس کا جواب دو۔"

"اگر تم مجھ کو انتظام ملک میں شریک کرنا چاہتے ہو تو جناب صاحب کلکٹر سے اجازت منگالو۔ میں صدر امین ہوں۔ مجھے انتظامی معاملات سے سروکار نہیں۔"

محمود خاں نے اس وقت تو لاجواب ہونے میں عافیت جانی اور اس نے سید احمد کو رخصت کردیا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ باتیں اسے پسند نہیں آئی ہیں۔

اس کی ناراضی کا اظہار بہت جلد ہو گیا۔ سید احمد کے مکان کو اس نے زور زبردستی سے چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ اس کے بعد بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا۔ کوئی موقع اذیت کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اب سید احمد دن رات اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی طرح نواب کے چنگل سے نکل جائے۔

اسی عرصے میں ہلدور کے چودھری' محمود خاں سے بگڑ گئے اور انہوں نے انبوہِ کثیر جمع کرکے محمود خاں کی فوج پر حملہ کردیا۔ نواب شکست کھا کر نجیب آباد چلا گیا۔ اس لڑائی کے دوران میں ہندو اور مسلمانوں میں وہ عداوت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے بجنور میں نہیں تھی۔ لڑائی ختم ہو گئی لیکن ہندو' مسلم فساد شروع ہو گیا۔

سید احمد اپنا مکان بند کیے بیٹھا تھا۔ محمود خاں کو شکست ضرور ہو گئی تھی لیکن یہ لازمی تھا کہ وہ دوبارہ پلٹ کر ضرور آئے گا۔ نواب کے دل میں یہ بات ضرور آئے گی کہ انگریزوں کے خیر خواہ ہونے کی وجہ سے ہلدور کے چودھریوں کو ہم نے لڑائی پر اکسایا ہے۔ دوسری طرف چودھریان ہلدور ہمارے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہماری طرف سے شک میں پڑ گئے ہوں گے اور یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

وہ ابھی یہاں سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ نواب محمود خاں بجنور پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اسے فتح ہوئی اور چودھری شکست کھا کر ہلدور کی طرف بھاگے۔ سید احمد بھی ہلدور کی طرف نکل گیا۔

سیاہی قسمت اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ محمود خاں نے چودھریوں کو سبق سکھانے کے لیے ہلدور پر بھی حملہ کردیا۔

چودھریوں کو شکست ہو گئی تھی۔ ہلدور کے مکانات آتش بازی کی طرح جل رہے تھے۔ اب اس کا ہلدور میں رہنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے ڈپٹی رحمت خاں کو ساتھ لیا اور ہلدور سے نکل گیا۔ سواری تو درکنار' رات کے اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ نہیں تھا۔ جس طرف منہ اٹھا' پیدل چل دیے۔ کبھی بھاگتے تھے کبھی آہستہ چلنے لگتے تھے۔

راستے میں موضع پھنیاں پڑتا تھا۔ ارادہ تھا کہ رات وہاں بسر کریں گے لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بہت لوگ انہیں لوٹنے اور جان سے مارنے کے لیے جمع ہیں لہٰذا راستہ بدلنا پڑا اور انہوں نے "پلانہ" کا راستہ اختیار کیا۔

پلانہ کی سرحد میں داخل ہو کر سکون کا سانس لیا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے بڑھیں گے۔ اچانک دو ہزار کے قریب مسلح دیہاتی کہیں سے نکل آئے۔ تمام لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"چودھریوں سے سازش کرکے مسلمانوں کو انہی لوگوں نے مروایا۔ ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا۔ یہ انگریزوں کے طرف دار ہیں۔ ان کے پٹھو ہیں۔ ہم انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

قریب تھا کہ یہ مجمع اپنے انتقام کی آگ ان کے خون سے بجھاتا' گاؤں کے چودھری نے بڑی دانش مندی سے انہیں وہاں سے نکال دیا۔

پیروں میں چھالے پڑتے جاتے تھے۔ پیاس سے حلق خشک تھے' کپڑے گرد میں اَٹ گئے تھے اور خوف کی چنگاریوں سے بدن پھنکنے لگا تھا۔ معاملے کی نزاکت کا احساس دل کو دہلائے دے رہا تھا۔ دراصل علاقے کے لوگ انہیں انگریزوں کے مخبر اور مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کا دشمن سمجھ رہے تھے۔ یہ خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلتی جارہی تھی لہٰذا جہاں جاتے تھے یہ بدنامی ان سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تھی۔ ڈپٹی رحمت خاں سخت گھبرائے ہوئے تھے جبکہ سید احمد خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنے ہوش میں تھا۔

"اب کیا کریں۔ کس طرف جائیں" ڈپٹی رحمت خاں نے کہا۔

"قریب دو کوس پر چاند پور ہے وہاں چلتے ہیں" سید احمد نے کہا۔

"وہاں بھی ہماری جانوں کے دشمن ہی بیٹھے ہوں گے۔"

"وہاں کے رئیس میر صادق علی میرے دوست ہیں۔ مجھے یقین ہے وہاں ایسی صورت پیش نہیں آئے گی۔"

اب دن نکل آیا تھا۔ سورج کی کرنیں' رستے کو تانبے کی طرح جلا رہی تھیں۔ اجاڑ ماحول' سنسان راستے۔ وہ دونوں پسینے میں شرابور' تھکن سے چور۔ کسی مرجھائے پھول کی طرح چاندپور میں داخل ہوئے۔

یہاں کے مسلمانوں کو شاید معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اس طرف آرہے ہیں۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ ڈھول پیٹے جانے لگے۔ منادی ہوگئی کہ وہ آگئے جن کا انتظار تھا۔ صدہا آدمی تلوار، گنڈاسے اور طمنچے لے کر دوڑ پڑے۔ موت سامنے کھڑی تھی لیکن زندگی نصیب میں تھی۔ میر صادق علی، رئیس چاند پور کو معلوم ہوا اور وہ اپنے ملازموں کے ساتھ پہنچ گئے۔ بندوق کے چند فائر ہوئے اور بھیڑ چھٹ گئی۔ انہوں نے جان پر کھیل کر حقِ دوستی ادا کیا اور ان دونوں کو اس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے آئے۔

دوسرے روز میر صادق علی اس معذرت کے ساتھ کہ وہ انہیں زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہرا سکتے، موضع بچولہ تک پہنچادیا۔ وہاں سے بچھراؤں چلے گئے۔ اب میرٹھ قریب تھا جہاں انہیں جانا تھا۔

ڈپٹی رحمت خاں تو خواجہ چلے گئے اور سید احمد نے میرٹھ کی راہ پکڑی جہاں انگریز حکامِ عالی اس کے منتظر تھے۔

وہ میرٹھ پہنچا تو اس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھا، اس کے پاس کچھ نہ تھا اور اس کرتے کی جیب میں چھ پیسے پڑے ہوئے تھے۔

میرٹھ پہنچتے ہی سفر کی کوفت نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اس بیماری نے اسے ایسا نڈھال کیا کہ پانچ مہینے تک میرٹھ سے کہیں اور جانے کے لائق نہ رہا۔

ان پانچ مہینوں میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔ باغی پسپا ہوتے ہوتے ناکام ہوگئے تھے۔ فتح شکست میں بدل گئی تھی۔ انگریز دوبارہ دہلی میں داخل ہوچکے تھے اور اب دوسرے علاقوں کی شورید گی کو دبانے کے لیے لڑائی کررہے تھے۔

فتح مند انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ جو شخص راہ میں ملا قتل کردیا گیا۔ معززینِ شہر اپنی آبرو کو بچائے گھر میں پڑے رہے، باغی شہر سے بھاگ نکلے۔ کوچہ و بازار میدانِ کارزار بنے تھے۔ بے گناہ قتل ہوئے، بے نوا مارے گئے۔ جا بجا مکانات میں آگ لگادی گئی۔ ستمبر کے مہینے تک ستم گری کی تمام حدیں پار ہوگئیں۔

سید احمد نے ایک وفادار ملازم کی حیثیت سے انگریزوں کی دوبارہ عمل داری کی خبر بڑی خوشی سے سنی لیکن اس نے یہ بھی سنا کہ جس وقت وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریزوں کا دفاع کرتا پھر رہا تھا، دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے اس کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا۔

جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہوچکا تو شہر کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ گورے سپاہیوں نے لوٹ مار کے شوق میں جہاں اور گھروں کو لوٹا، سید احمد کے مکان پر بھی چڑھ دوڑے۔ اس کے ماموں وحید الدین خاں اور ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں گولی کا نشانہ بن گئے۔ جس کا منہ جس طرف اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔

اس سے زیادہ کوئی وہاں کا حال کیا بتاتا۔ کوئی کچھ نہ بتائے لیکن بے کسی کا ماحول بتا رہا تھا کہ کس پر کیا گزری ہوگی۔ کیا خبر کون مرا کون زندہ رہا۔ وہ زندوں کی تلاش میں میرٹھ سے دلی پہنچ گیا۔

یہ اسی کا شہر تھا لیکن پہچانا نہیں جاتا تھا۔ غالب اپنے گھر میں بند بیٹھے تھے۔ ان کا بھائی یوسف مارا گیا تھا۔ صہبائی کا گھر زمین سے لگ گیا تھا۔ احسن اللہ خاں کے گھر کو آگ لگادی

ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کردیجئے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام میرے لائق سمجھیں اسی کے واسطے سفارش کردیں۔

سید احمد کی تفسیر القرآن کی ان دنوں خوب مخالفت ہورہی تھی لہٰذا لکھ بھیجا "میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے۔ وجہِ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں کہ آپ میری تفسیر کے خلاف لکھیں اور چھپوائیں خدا چاہے تو آپ کی کتاب خوب بکے گی اور آپ کو تنگیِ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور، اثر، وسعت، جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔

(شبلی نعمانی)

گئی تھی۔ خود بادشاہ پابندِ سلاسل تھا۔ جہاں کندھے سے کندھے ملتے تھے، اب کوئی شناسا نظر نہ آتا تھا۔ وہ سناٹا تھا کہ خوف ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی حویلی میں اب دیواروں کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس کی ماں آٹھ دن سے جلوخانے کی ایک کوٹھری میں، ایک ملازمہ زیبن کے ساتھ بند ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح اس کوٹھری کی طرف بھاگا اور کوٹھری کے دروازے کو اپنے سینے کی طرح پیٹ ڈالا۔

"ہیں! تم یہاں کیوں آگئے۔ یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ، ہم پر جو گزرے گی، گزر جائے گی۔"

"بی اماں، اب میں آگیا ہوں، اب کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم چلے جاؤ۔ یہ لوگ کسی کو نہیں جانتے۔ ان لوگوں نے کسی کو نہیں چھوڑا، سب ختم کردیا۔"

"آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں ابھی قلعے کے انگریزوں اور دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔"

یہ سن کر ان کی کچھ ڈھارس بندھی۔ خوف سے پھٹی آنکھوں میں اُمید کی کرن نے صورت دکھائی۔

اب سید احمد نے بھی کوٹھری میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک طرف ٹوٹے ہوئے برتن میں گھوڑے کا دانہ رکھا تھا۔

"بی اماں، یہ کیا؟"

"تین دن سے کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اسی کے سہارے تو سانس کی ڈور تھمی ہوئی تھی۔ اب دو دن ہوئے، پانی بھی ختم ہوچکا۔ کہیں سے دو گھونٹ پانی لادو۔ اپنے گورنر سے کہو پانی تو لادے۔"

یہ سنتے ہی وہ کوٹھری کا دروازہ پھلانگ کر باہر آیا اور پانی کی تلاش کرنے لگا۔ کنوئیں تھے لیکن اسے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے پانی نکالا جاسکے۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کوئی ذی روح نہیں تھا جس سے مدد مانگتا۔ وہ سیدھا قلعے کی طرف گیا اور ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا بوڑھی ملازمہ زیبن سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آب خورہ ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ نقاہت کے مارے چلا نہ گیا۔

سید احمد نے اس کے آب خورے میں پانی ڈالا "لو پانی پی لو۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور گھر کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہا۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ بی بی پیاسی ہیں ان کے لیے پانی لے جاؤں گی۔

"میرے پاس پانی بہت ہے۔ ان کی فکر چھوڑ۔ تو پانی پی لے۔"

اس نے پانی پیا اور وہیں سڑک پر لیٹ گئی۔ سید احمد دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو پینے کے لیے پانی دیا۔ انہوں نے پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

سید احمد گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کرکے والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جائے۔ باہر آکر کیا دیکھتا ہے کہ زیبن مری پڑی ہے۔

جہاں انسان نہ ہوں وہاں سواری کا کیا کام۔ اس کے باوجود کہ حکام نے احکام جاری کیے، کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعے کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم (بیل گاڑی) جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو ڈاک لے جاتی ہے، وہ اس شکرم میں اپنی عورتوں کو لے جاسکتے ہیں۔

وہ شکرم لے کر گھر آیا اور والدہ اور خالہ کو بٹھا کر اس شہرِ خموشاں سے میرٹھ کی طرف چل دیا۔

میرٹھ میں منشی الطاف حسین نے اس کے رہنے کے لیے ایک مکان خالی کردیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی والدہ زندہ بچ کر یہاں آگئیں۔

"سید صاحب، آپ پر اور آپ کے گھر والوں پر جو کچھ گزری اسے سن کر کلیجا منہ کو آتا ہے" منشی الطاف حسین نے ان کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر تو کچھ بھی نہیں گزری" سید احمد نے کہا "جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد ہوئے، یہ سوچ کر دل شق ہوتا ہے۔"

"ہاں بھائی، یہ تو ہے۔ اور بات پھر وہیں کی وہیں رہی۔"

"الطاف صاحب، نہ مجھ کو اپنے گھر لٹنے کا رنج ہے نہ مال و اسباب تلف ہونے کا۔ اگر رنج ہے تو اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزری، اس کا رنج ہے۔"

"سید صاحب، سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟"

"سوال تو یہی ہے۔ مسلمان قوم جس طرح بے اعتبار ہوئی ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس اعتبار کو بحال کرنے میں جگ بیت جائیں گے۔ انگریز قوم اب ہماری بھلائی کے لیے سوچنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔ ہم دانے دانے کو محتاج ہوجائیں گے۔ تعلیم میں کورے رہ جائیں گے۔ نوکریوں سے جاتے رہیں گے۔ اب شاید میری تمام عمر اس کوشش میں گزر جائے کہ انگریزوں کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلاسکوں۔"

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو خیالوں نے پاؤں پھیلادیے۔ خیالوں کی گزرگاہ ایسی طویل تھی کہ اس کی دانش

کی چادر چھوٹی پڑنے لگی۔ اسے مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب اس کی قوم اس کا ساتھ دے گی۔ اپنی قوم کو جہالت سے باہر نکالنا ہوگا۔ انہیں تیار کرنا ہوگا کہ وہ جدید علوم حاصل کریں۔ ان کی مذہبی حالت کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ انہیں یہ بتانا ہوگا کہ انگریز اچھوت نہیں ہیں' اہلِ کتاب ہیں۔ انہیں قائل کرنا ہوگا کہ انگریز ان کے دشمن نہیں ہمدرد ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی طرح ترقی کرنی ہوگی۔ ہمیں تنگ نظری کے جوہڑ سے باہر نکلنا ہوگا۔ مقابلے کے بجائے مصالحت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی زندگی' اپنے افکار' اپنا ادب' اپنے خیالات' سب کچھ تبدیل کرنا ہوگا۔ کیا اتنے کام ایک آدمی کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں لیکن مجھے اس کی ابتدا کرنی ہوگی۔ پھر لوگ ساتھ آتے جائیں گے اور قافلہ بنتا جائے گا۔ میں ایک تحریک چلاؤں گا۔ اصلاحی تحریک' تبدیلی کی تحریک۔ ترقی کی تحریک۔ مجھے معلوم ہے' میرے خلاف زبانیں چلیں گی لیکن کب تک چلیں گی آخر تھک جائیں گی۔ میں جج ہوں۔ میں منصف ہوں۔ شاید اسی لیے قدرت نے مجھے یہ عہدہ دیا تھا۔ میں انگریزوں کی عدالت میں مسلمانوں کا مقدمہ لڑوں گا۔ انہیں بری کراؤں گا۔ اس کے بعد انہیں راغب کروں گا کہ وہ اپنی اصلاح کریں۔ اس کے بعد ہی تو اس قوم کے آسمان پر ترقی کا سورج طلوع ہوگا۔

وہ انہی خیالوں میں غلطاں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ بہت دنوں بعد اسے پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس کی والدہ اس کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ انگریزوں کی عمل داری دوبارہ ہوگئی تھی۔ اس سے بھی وہ مطمئن تھا البتہ اسے دیگر رشتے داروں کی فکر تھی جو غدر کے ہنگامے میں اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔

وہ صبح سو کر اٹھا اور تیار ہو کر اپنے بعض انگریز دوستوں سے ملنے چلا گیا۔

واپس آیا تو والدہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ مسلسل بھوک اور پیاس نے آنتوں کو ایسا کمزور کر دیا تھا کہ پانی' غذا کچھ ہضم نہ ہوتا تھا۔ فوراً حکیم بلایا گیا۔ اس نے دوائیں تجویز کردیں۔ جب پانی ہضم نہ ہوتا تھا تو دوا کیا پیٹ میں اترتی۔

علاج برابر جاری رہا لیکن صفرا کا اتنا غلبہ تھا کہ کوئی چیز ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر میرٹھ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

○☆○

فروری ۱۸۵۸ء کو سیکریٹری گورنمنٹ کا خط مسٹر شیکسپیئر کے نام پہنچا کہ فوراً ضلع بجنور روانہ ہوجاؤ اور فوج کو مورچے سنبھالنے کا حکم دو۔ سید احمد اور تمام عملہ جو بجنور سے بھاگ کر میرٹھ آگیا تھا مسٹر شیکسپیئر کے ساتھ بجنور کے لیے روانہ ہوگیا۔

انگریزوں کے چلے آنے کے بعد بجنور مسلسل خانہ جنگیوں کی زد میں رہا تھا۔ کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کیے کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر۔ آخر محمود خاں سب پر غالب آگیا تھا۔

جب انگریزی فوج رڑکی پہنچی اور بجنور پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہوئی تو یہ بحث چھڑ گئی کہ بجنور پر حملے کے وقت کون لوگ حکومت کے باغی تصور کیے جائیں۔

وہ ہندو رئیس جنہوں نے مسلمانوں سے شکست کھائی تھی' چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو باغی تصور کیا جائے۔ افسرانِ فوج اور انگریز حکام کے خیالات بھی مسلمانوں کی نسبت اچھے نہیں تھے۔ وہ بجنور کے ہر مسلمان کو محمود خاں کا ساتھی تصور کرتے تھے۔

سید احمد نے فوراً مسٹر شیکسپیئر سے اس بارے میں گفتگو کی "باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار کے مقابلے پر آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے کے خلاف کیے' ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے نزدیک اگر اب کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں حاضر ہوجائیں تو ضلع بجنور کے کسی مسلمان کو باغی نہ قرار دیا جائے۔"

"سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ انہوں نے اپنی خدمات کو ہزاروں روپے میں انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز ان کا سر کاٹ کر لندن لے جائیں گے اور لندن کے عجائب خانے میں رکھیں گے۔

ایک بار یہ تذکرہ خود سرسید کے سامنے آیا۔ انہوں نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ کہا۔

"جو چیز خاک میں مل کر خاک ہوجانے والی ہے اس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہوسکتی ہے کہ دانش مند لوگ اس کو روپے دے کر خریدیں اور اس کی قیمت کا روپیا قوم کی تعلیم کے کام آئے۔"

(الطاف حسین حالی)

اس پر بھی بہت کچھ بحث ہوئی لیکن شیکسپئر کو سید احمد پر جو بھروسا تھا بلکہ احسان تھا اسے دیکھتے ہوئے اُس کی رائے کو مان لیا گیا۔ اگر اس کے برخلاف فیصلہ ہوا ہوتا تو ضلع بجنور میں ایک بھی مسلمان زندہ نہ بچتا۔

مسلمانوں کے حق میں سید احمد کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ اب اسے اپنے منصوبے کے مطابق بہت دنوں تک مسلمانوں کی صفائی پیش کرنے کے عمل کو جاری رکھنا تھا۔

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدر الصدوری (سیشن جج) کے عہدے پر ترقی پاکر مراد آباد آگیا۔

ایک سال بعد باغیوں کی جائدادوں کی ضبطی کے متعلق عذرداریوں کے متعلق ایک کمیشن بیٹھا۔ اس کمیشن کے لیے ہندوستانی ممبر کے طور پر سید احمد کو منتخب کیا گیا۔

انگریزوں کو تو ہر مسلمان ہی باغی نظر آتا تھا لیکن سید احمد کی موجودگی کی وجہ سے سیکڑوں مسلمان بری کیے گئے اور ان کی جائیدادیں بحال ہوئیں اور انگریزوں کے دلوں میں یہ خیال پختہ ہونے لگا کہ ہر مسلمان ہی باغی نہیں ہے۔

سید احمد کی ان کوششوں سے سمندر کے چند قطرے ہی گُہر بن سکے تھے۔ ابھی پورا ہندوستان باقی تھا۔ گورنمنٹ کا غصہ خاص طور پر مسلمانوں کے حال پر بدستور موجود تھا۔ ہندو، خیرخواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے جی کھول کر بدلہ لے رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ ان کا مسلمان ہونا ہی کافی تھا۔

زمانہ نہایت نازک تھا۔ خیالات کے اظہار کی قطعی آزادی نہیں تھی۔ سید احمد لاکھ وفادار سہی لیکن تھا تو مسلمان۔ مسلمانوں کی حد سے بڑھی ہوئی حمایت خود اسے نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن دل تھا کہ بے قابو ہوئے جاتا تھا۔ مسلمانوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا۔ اسے دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ ملکی بغاوت نہیں تھی بلکہ صرف سپاہیوں کی حکم عدولی تھی اور اس کے پیچھے بھی انگریز حکام کی بعض غلطیاں تھیں جو اتنی بڑھ گئیں کہ غصے میں ڈھل گئیں۔ مذہبی توہمات کے سبب عام لوگ بھی اس میں شریک ہوگئے۔

وہ یہ سوچتا ضرور تھا لیکن اپنا دل انگریزوں کے دل میں کیسے ڈالتا پھر اس نے ایسے خطرے مول لیے جو اس ماحول میں جان دے کر ہی خریدے جاسکتے تھے۔ ذرا ہوا بدلتی تو وہ گلشن کی حفاظت میں خود بکھر سکتا تھا۔

اس نے قلم کو زبان کیا اور انگریزوں کی بدگمانیوں کے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ تمام الزام جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے، نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ تحریر کے حوالے کیے اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے، ان کی تردید کی اور ان کو غلط ثابت کیا۔ اس رسالے کا نام اس نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" رکھا اور نہایت خاموشی سے پانچ سو جلدیں چھپوالیں۔

یہ کام اس نے اتنی خاموشی سے کیا کہ قریبی دوستوں تک کو ہوا نہیں لگنے دی لیکن جب جلدیں چھپ کر آئیں تو کچھ دوستوں کو معلوم ہو ہی گیا۔

رائے شنکرداس، منصف گھبرائے ہوئے اس کے پاس آئے۔ خبر کی تصدیق ہوتے ہی وہ فکرمند ہوگئے۔

"ان تمام کتابوں کو جلادو۔ ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں مت ڈالو۔"

"میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک و قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند پہنچ جائے تو گوارا ہے۔"

"گزند نہیں۔ اس وقت انگریز پاگل ہو رہے ہیں۔ اپنے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔ تمہاری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"جان کا کیا ہے، کسی دن تو جانی ہے" سید احمد نے کہا۔ "یہ کتاب میں نے صرف چھپوائی نہیں ہے، اسے پارلیمنٹ کے پاس بھی بھیجوں گا۔"

"جب تم نے طے کرہی لیا ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے" رائے شنکرداس آبدیدہ ہوکر خاموش ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد سید احمد نے دو رکعت نمازِ نفل ادا کی، دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانچ سو جلدوں کا پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند اس نے محض گورنمنٹ کے ملاحظے کے لیے لکھا تھا۔ اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام، افسران اور عوام واقف نہ ہونے پائے لہٰذا سید احمد کے دل کی بے چینی دور نہ ہونے پائی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ جتنے رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے، ان میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہتے۔

اس موقع پر سید احمد نے ایک مرتبہ پھر کمر ہمت باندھی۔ اس نے "لائل محمڈنز آف انڈیا" کے عنوان سے ایک ایسا رسالہ جاری کیا جس میں انہوں نے مسلمانوں کے

ایسے کارنامے چھاپنے شروع کیے جو گورنمنٹ کی خیرخواہی کے لیے جاں بازی اور جاں نثاری کے بے مثال مظاہرے تھے۔ ہر شخص کا حال اتنا مفصل اور مدلل تھا کہ مسلمانوں پر لگنے والے الزامات کی قلعی کھلتی تھی۔ سب سے بڑی مثال تو خود سید احمد کی تھی۔

اس کا ارادہ تھا کہ جب ایسے اشخاص کے تذکرے خاطرخواہ تعداد میں تحریر ہوجائیں گے تو اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے اس رسالے کے صرف تین نمبر ہی نکل سکے اور ۱۸۶۱ء میں اسے بند کرنا پڑا۔ اسی سال اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ذمّے داری اس پر آن پڑی۔

اس کی عمر اس وقت چوالیس برس تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ۔ وہ دوسری شادی کرسکتا تھا۔ دوستوں نے اصرار بھی کیا لیکن دل کے بجھے ہوئے کنول نے اجازت نہیں دی۔ وہ اپنی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کرچکا تھا اور جانتا تھا کہ اسے شادی کی نہیں، وقت کی ضرورت ہے۔

۱۸۶۲ء میں اس کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور ہوگئی۔ قوم کی بھلائی کا خیال اس کے ساتھ آیا تھا لیکن مسلسل تجربات نے نوعیت بدل دی تھی۔ اب اسے پختہ یقین ہوگیا تھا کہ جب تک علم کی روشنی نہیں پھیلے گی، اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں۔

تعلیم سے اس کی مراد وہ جدید علوم تھے جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔

مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اس لیے جدید علوم کی اشاعت صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ جب علم کی رغبت بڑھے گی تو لوگ خودبخود انگریزی سیکھنے کی طرف مائل ہوں گے۔ ان ترجموں سے مغربی علوم کی وقعت بھی دلوں میں پیدا ہوگی اور انگریزوں سے ربط و اتحاد بھی پیدا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیرِ ہند تھے، انہوں نے سوسائٹی کا پیٹرن بننا منظور کیا۔ ان کے علاوہ اور کئی اور انگریز حکام پیٹرن قرار پائے۔ بہت سے رئیس ہندو اور مسلمان اس کے ممبر بنے اور ترجمے کے کام کا آغاز ہوا۔

سید احمد کا ارادہ اسے کالج تک ترقی دینے کا تھا لیکن اسی سال ۱۸۶۴ء میں اس کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ اسکول تو وہیں رہا لیکن وہ بھلائی اور خدمت کے تمغے بانٹتا ہوا علی گڑھ آگیا۔

سائنٹی فک سوسائٹی کا اس کے بغیر چلنا ممکن نہیں تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف بھی وہ علی گڑھ لے آیا۔

اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ نہ صرف نئے نئے کام سوچتا تھا بلکہ ان کاموں کی تکمیل کے لیے اسے لوگوں کو قائل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ وہ سوسائٹی کا سامان لے کر علی گڑھ میں داخل ہوا تھا، اس کی عمارت لے کر نہیں لیکن اس نے یہاں پہنچتے ہی فیاض ہمدردوں کے سامنے ہاتھ پھیلادیا۔ تیس ہزار کی لاگت سے ایک عالی شان عمارت، دل کشا چمن اور وسیع احاطہ سائنٹی فک سوسائٹی کے دفتر کی شکل میں ڈھل گیا۔

چند برس کے عرصے میں بہت سی مفید کتابیں اس سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے چھاپ دیں۔

جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے سراہنے والے بھی پیدا ہوہی جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی کی مخالفت کرنے والے بھی موجود تھے لیکن اس کی افادیت کے قائل بھی اسی ہندوستان میں تھے۔ حکومت مجبور ہوگئی کہ اس سوسائٹی کے لیے سالانہ امدادی رقم جاری کرے اور ہندوستان کے کئی رئیسوں نے اس کی امداد کے لیے رقوم بھیجنی شروع کردیں۔

ترجموں کے ساتھ ساتھ سید احمد نے اس سوسائٹی کے تحت ایک اخبار بھی نکالنا شروع کردیا۔ اس اخبار کے اجرا سے وہ ذریعہ ہاتھ آگیا جس کے ذریعے ہندوستانیوں کا موقف حکومت پر ظاہر کیا جاسکتا تھا۔

شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچے سے شروع ہوئی۔

اسی اخبار میں جب وہ علی گڑھ سے تبدیل ہوکر بنارس میں فرائضِ منصبی انجام دے رہا تھا، اس نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا جائز ہے اور ہندوستان کے سوا دنیا کے تمام مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے جواب میں ایک صاحب نے لکھنؤ سے خط لکھا "میں اس دن کے دیکھنے کا مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔"

خدا جانے یہ طنز تھا یا ان صاحب نے واقعی خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے اسے طنز ہی سمجھا۔ وہ بہت دن سے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے لگے تھے لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ رسم ورواج کی قیدیں محض ایک آدمی کے اٹھادینے سے نہیں اٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں سے بدگمان ہونا، اس

وقت تک موقوف نہ ہوگا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول نہ ہو لہٰذا اس نے ایک مبسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۸ء میں بنام "رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب" لکھ کر شائع کی جس میں آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ اور روایات فقہی سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے پر' اس بات پر استدلال کیا کہ انگریزوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ خود ان کے ہاتھ کا پکا ہوا' انہی کے برتنوں میں اور انہی کا ذبیحہ جس طرح کہ انہوں نے کیا ہو' کھانا درست ہے۔ صرف شراب اور سؤر حرام ہے۔

یہ اتنی عجیب باتیں تھیں کہ مخالفتوں کی آندھی نے سید احمد کو اڑانے کے لیے بڑا زور باندھا۔ مختلف پرچوں اور محفلوں میں اسے کرسٹان کہا اور لکھا جانے لگا۔ اس رسالے کے جواب لکھے گئے بلکہ یہ اپیلیں بھی کی گئیں کہ اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیا جائے۔

سائنٹی فک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا۔ سوسائٹی کے تمام ارکان علی گڑھ میں جمع تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ الطاف حسین حالی بھی آئے ہوئے تھے۔ سید احمد سے ان کی شناسائی نہیں تھی لیکن اس کے خیالات سے وہ متاثر ضرور ہونے لگے تھے۔

سوسائٹی کے جلسوں میں سید احمد کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ بجھا بجھا تھا۔ ہر وقت کچھ سوچتا ہوا' جھنجلایا ہوا۔

آخری اجلاس ختم ہوا تھا۔ بہت سے لوگ اس کی کوٹھی پر موجود تھے۔ بے تکلفی سے خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ سید احمد نے اچانک سب کو مخاطب کیا۔

"آپ حضرات کو معلوم ہے' سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچ چکی ہے؟"

"جی ہاں' سنا تو ہم نے بھی ہے۔"

"صرف سنا ہی سنا ہے' افسوس کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔"

"انگریزی داں ہندوستان میں ہیں کتنے جو اس کتاب کا اثر لیں گے" کسی نے کہا۔

"بے شک' آپ نے ٹھیک کہا لیکن ذرا یہ تو سوچئے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد انگریزوں کے دلوں میں اسلام کی کیا وقعت رہ جائے گی اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے خیالات کیا ہوں گے۔"

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سید احمد کی بھاری آواز پھر گونجی "ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی اصلیت عیسائی قوم پر ظاہر کی جائے اور غلطیوں کی نشاندہی کی جائے جو اس کتاب میں بانیٔ اسلام کو سمجھنے میں کی گئی ہیں۔ ہائے ہائے' اسلام وہ ہے نہیں جو اس مصنف نے سمجھا ہے۔"

سناٹا اب بھی طاری تھا پھر لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

"آپ لوگ گواہ رہئے گا کہ اس کتاب کا جواب لکھنے کا میں ارادہ کر چکا ہوں۔"

اس نے اپنے ارادے کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے عیش و آرام کو تج دیا۔ اس نے ایک انگریزی خواں نوجوان کو ملازم رکھا جو اس کتاب کے ضروری حصے پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو اس کام پر لگایا کہ وہ دورِ جاہلیت کے عربی شعرا کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کرے جن میں قبل از اسلام کی فرسودہ رسموں کا ذکر کیا گیا ہے اور جو اس کتاب کا جواب لکھنے میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ دشوار ترین مرحلہ یہ تھا کہ حوالوں کے لیے کتب تلاش کی جائیں۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہ تمام نجی کتب خانے تباہ ہو گئے جہاں یہ کتابیں مل سکتی تھیں۔

اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ ولایت کا سفر اختیار کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر اس کا جواب لکھا جائے لیکن یہ ارادہ حصولِ کتب سے بھی دشوار تھا۔ ولایت کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ بنگال اور بمبئی کے چند اشخاص ہی ایسے تھے جنہوں نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ اس سفر کے مصارف اور دقتوں کو برداشت کرنے کی وہ خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔

اس کا دل جلتا رہا۔ مصنف کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا۔ دوست اسے تسلی دیتے رہے لیکن دل کے آنسو کہیں تسلیوں سے خشک ہوتے ہیں۔ ولایت جانے کی پیاس تھی لیکن سبیل نظر نہیں آتی تھی۔

وہ دن اس کے لیے بڑی خوشی کا تھا جب گورنمنٹ نے چند دوسرے طلبہ کے ساتھ اس کے بیٹے سید محمود کو بھی تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجنے کے لیے اسکالرشپ جاری کیا۔ سید محمود سے اسے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور اب یہ امیدیں سرسبز ہونے کو تھیں۔

گورنمنٹ کی اس امداد نے سید احمد کے ارادے کو نئی زندگی بخش دی۔ اس نے طے کیا کہ وہ بھی بیٹے کے ساتھ جائے گا۔

سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے اپنے

کتب خانے کو بیچا، کوٹھی کو رہن رکھا، جہاں سے قرض مل سکتا تھا، قرض لیا اور رخصت کے لیے حکومت کو درخواست دے دی۔

"گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو استحکام بخشنے کے واسطے اس کے سوا کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بہ چشم خود مشاہدہ کرلیں۔

اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جاکر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔"

وہ اس درخواست میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خطباتِ احمدیہ کا جواب لکھنے جارہا ہے۔ اس نے اس دورے کو مطالعاتی دورے سے تعبیر کرکے چھٹی حاصل کرلی۔

ولایت جانے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس کے انگریز دوست اسے الوداعی عشائیے دے رہے تھے۔

"مسٹر سید! آپ بمبئی ہوتے ہوئے انگلستان جائیں گے یا دلی سے بحری جہاز میں بیٹھیں گے؟" اس کے دوست والٹر اسمتھ نے عجیب و غریب سوال کیا۔

"آپ دلی میں سمندر بہادیں، میں دلی سے انگلستان چلا جاؤں گا" سید احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ آپ حلیہ بدل کر بمبئی چلے جائیں۔ دلی تو جا نہیں رہے ہیں کہ کوئی ٹوکے گا۔ آپ اپنا لباس بدل لیں۔ جو لباس آپ اب پہنتے ہیں، انگلستان میں اس لباس میں آپ عجوبہ لگیں گے۔"

"آپ کے خیال میں مجھے کیا لباس پہننا چاہیے؟"

"آپ ترکی کوٹ اور پتلون پہنیں۔ سر پر ترکی ٹوپی رکھ لیں۔"

"ارے واہ! یہ تو آپ نے اچھی کہی۔ یہ لباس تو قومی لباس بننے کے لائق ہے۔"

"آپ پہنیں گے تو بنے گا نا۔"

"آپ اپنے ٹیلر ماسٹر کو میرے پاس بھیجئے گا۔ اسی سے کہوں گا کہ وہ مجھے دلی والے سے ترک نژاد بنادے۔"

اب تک وہ گول یا چوگوشہ ٹوپی پہنا کرتا۔ اس پر صدری، ٹخنوں سے اونچا مغلئی پاجامہ اور گلے میں بڑا سا رومال باندھتا تھا لیکن والٹر اسمتھ اور بعض دوسرے دوستوں کے مشورے سے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور پتلون اور بوٹ پہننے لگا۔ دونوں بیٹوں اور دو خدمت گاروں کے لیے بھی اس نے یہی لباس بنوادیا جو اس کے ساتھ انگلستان کے سفر پر جارہے تھے۔

پہلی اپریل ۱۸۶۹ء کو پانچ افراد کا یہ قافلہ بنارس کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو دوستوں کا ہجوم، الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر جمع تھا۔ ان میں مسلمان عمائدین بھی تھے، انگریز حکام بھی اور ہندو بھی۔ وہ سب کی آنکھ کا آنسو بنا ہوا تھا۔

ہنسی میں اداسی کا رنگ گھلا اور ریل نے رینگنا شروع کیا۔ دوستوں نے بہ چشم نم رخصت کیا۔

دوسرے دن الہ آباد پہنچ کر گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں قیام کیا۔ اس روز آدھی رات کے بعد الہ آباد چھوڑدیا۔ کچھ سوتے کچھ جاگتے، یہ آدھی رات بھی کٹ گئی۔

علی الصباح آنکھ کھلی۔ سید حامد اور سید محمود کب سے کھڑکی سے لگے بیٹھے تھے۔ اس نے بھی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایک نیا ملک اور نئی زمین اس کی آنکھوں کے سامنے بچھی ہوئی تھی۔ سیاہ مٹی اور جابہ جا پہاڑوں کے ٹیلے حبشی غلاموں کی طرح استادہ۔

کھلے میدانوں میں کھپریل کے چھوٹے چھوٹے گھر نظر آرہے تھے۔ کہیں پانچ، کہیں سات، کہیں دس۔ یہ دراصل یہاں کے گاؤں تھے۔ یہ گاؤں اتنے مختصر تھے کہ گھر، آنکھوں سے گنے جارہے تھے۔ ان قدیم گھروں سے گزر کر صرف ایک اچھی بستی نظر آئی۔ ایک مکان نہایت خوبصورت تھا۔ معلوم ہوا، راجا کے رہنے کا مکان ہے۔ شہرپناہ بھی بہت خوبصورت تھی۔ ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر میہردیوی کا مندر تھا اسی لیے اس بستی کا نام میہر تھا۔

تیسری اپریل کو جبل پور پہنچے۔ اسٹیشن پر ہی انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ پامر ہوٹل اپنی بہترین سروس اور صفائی ستھرائی کے اعتبار سے ان کے لیے نہایت مناسب ہوگا۔

پامر ہوٹل اپنی عمارت کے اعتبار سے واقعی شاندار تھا اور اپنے مالک کے ذوقِ جمال کی نشاندہی کررہا تھا۔ پامر صاحب (ہوٹل کے مالک) نہایت تپاک سے ملے اور ان کے لیے دو کمروں کا انتظام کردیا۔

رات کے کھانے کے بعد مسٹر پامر ان سے ملاقات کے لیے کمرے میں آئے۔

"آپ کو ہماری جانب سے کسی شکایت کا موقع تو نہیں ملا؟" پامر صاحب نے پوچھا۔

"مجھے زیادہ تجربہ تو نہیں لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک شاندار ہوٹل ہے۔"

"شکریہ! ہمارے لیے کوئی اور خدمت؟"

سید احمد نے سوچا، موقع اچھا ہے۔ سواری کے بندوبست کا بار بھی مسٹر پامر پر ہی ڈال دیا جائے۔

"ہمیں یہاں سے ناگپور جانا ہے۔ آپ سواری کا بندوبست کرادیں۔"

"کیا مطلب؟ آپ نے سواری کا بندوبست نہیں کیا ہے؟ آپ کو تو یہاں پہنچنے سے پہلے کسی کمپنی سے بات کرلینی چاہیے تھی۔"

"واقعی! یہ غلطی ہم سے ہو تو گئی لیکن کیا حرج ہے، یہاں بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"ہو تو سکتا ہے لیکن پندرہ دن سے پہلے آپ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ آج آپ ٹکٹ لیں گے تو پندرہ دن بعد سواری مل سکے گی۔"

"اس طرح تو ہم تاریخ مقررہ پر بمبئی نہیں پہنچ سکیں گے، دیر ہوئی تو لندن کا جہاز نکل جائے گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے۔ آپ کو سواری کا بندوبست کرکے جبل پور آنا چاہیے تھا۔"

اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے واقعی وہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ جبل پور سے ناگپور تک ریل نہیں تھی۔ اونٹ گاڑیوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کیا جاتا تھا۔ ایسی کمپنیاں تھیں جو یہ سواریاں مہیا کرتی تھیں لیکن ضروری نہیں تھا کہ یہ سواریاں ہر وقت میسر آجائیں۔ اگر وقت پر سواری نہیں ملی تو کیا ہوگا۔ بمبئی میں کھڑا جہاز انتظار تو نہیں کرے گا۔

صبح ہوئی تو شکرم، ہوٹل کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی، ایک پرانی سی گاڑی تھی جس میں بیلوں کی جوڑی جتی ہوئی تھی۔

"بڑی مشکل سے اس گاڑی کا انتظام ہوا ہے۔ آپ کی قسمت اچھی تھی کہ یہ بھی مل گئی" پامر صاحب نے کہا۔

"یہ مریل بیلوں کی جوڑی کتنے دن میں ناگپور پہنچادے گی؟"

"زیادہ نہیں تین دن لگیں گے۔"

"تین دن!"

"راستہ پتھریلا اور ناہموار ہے اس لیے دیر تو لگے گی۔"

شکرم اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ پانچ آدمی آرام سے بیٹھ سکیں۔ ملازم چھجو کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ جگہ نکل آئی۔ پھر بھی یہ فکر ضرور تھی کہ ایک نہیں تین دن کیسے گزریں گے۔ ٹخ ٹخ کی آواز کے ساتھ بیلوں نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ بیل ایسے ڈھیٹ اور سست رفتار تھے کہ ہائے، ہائے، ہانکوں ہانکوں کرنے پر بھی بڑھیا کے چرخے سے بھی آہستہ چل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو رہا تھا۔

سورج، آسمان کے گھونگھٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ میلوں تک پتھریلی زمین پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی کے جھٹکوں نے ابھی سے کمر میں درد کرنا شروع کردیا تھا۔

دوپہر ہوئی تو سورج کی کرنوں کے سامنے آنکھوں نے اٹھنا چھوڑ دیا۔ ہوا کا گزر شاید اس میدان میں ہوتا ہی نہیں تھا۔ لو کی تپش تھی کہ بھیجے کو پگھلائے دے رہی تھی۔

یہ سوچ کر ساتھ لایا ہوا پانی بے دردی سے پیتے رہے کہ آگے کوئی کنواں ملے گا تو پانی لے لیں گے۔ پانی ختم ہوا تو پانی کی فکر ہوئی۔

"بھائی کوچوان! کہیں کوئی کنواں دیکھو تو گاڑی روک لینا۔ ذرا پانی بھرنا ہے۔"

"کنوئیں تو بہت ہیں صاحب لیکن بارش نہیں ہوئی ہے۔ سارے کنوئیں خشک پڑے ہیں۔"

"کنوئیں خشک پڑے ہیں؟ پانی کا کیا ہوگا؟ ہمارے پاس تو پانی ہی ختم ہوگیا اور تمہارے بیلوں کا کیا ہوگا؟"

"یہ تو عادی ہیں جی۔ کچھ دور چل کر نربدا کا دریا آئے گا۔ وہاں شاید پانی مل جائے۔"

دریا کا نام سن کر سب خوش ہوگئے۔ خیال آیا کہ منہ ہاتھ بھی دھولیا جائے گا۔ اس تصور ہی سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس شدید گرمی میں دریا دیکھنے کو ملے گا۔

کوچوان نے نوید سنائی کہ بس دریا آگیا۔ سب نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ دریا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

"کہاں ہے دریا بھائی؟"

"ابھی کہاں، ڈھلوان اتر کر دریا آئے گا۔"

ڈھلوان کیا تھی، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کی تہ میں اتر رہے ہیں۔ بیل سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھ رہے تھے۔ ہر قدم پہ معلوم ہوتا تھا کہ اگلے قدم میں گاڑی الٹ جائے گی۔

ڈھلوان گھاٹی کو طے کرکے قعرِ زمین پر پہنچے تب پانی کی شکل نظر آئی۔ خشک سالی سے دریا بھی خشک پڑا تھا۔ زیادہ عرض نہ تھا اور پانی صرف گھٹنوں گھٹنوں تھا۔

اس دریا پر کشتیوں کا پل بنا ہوا تھا۔ اس پل پر سے اس طرح اترے جیسے سامنے بھی چل رہے ہیں اور دائیں بائیں بھی۔

پل سے اترنے کے بعد جس قدر ڈھلان اترے تھے، اسی قدر چڑھائی تھی۔ اب عقل حیران تھی کہ یہ بیل اتنی

چڑھائی کیسے چڑھیں گے۔ کوچوان گیا اور کہیں سے دو بھینسے لے آیا۔ بھینسے اس مقصد کے لیے کرائے پر چلتے تھے کہ بیل گاڑیوں کو کھینچ کر اوپر پہنچائیں گے۔ غرض ان بھینسوں نے شکرم کو کھینچ کر اوپر پہنچایا۔

آہستہ آہستہ چلنے کا مقابلہ پھر شروع ہوگیا۔ تقریباً پانچ میل چلنے کے بعد بیلوں کی چوکی تھی جہاں شکرم کے بیل بدلے جاتے تھے۔ بیل بدلنے کے بعد سفر پھر شروع ہوگیا۔

جبل پور سے ناگپور تک پختہ سڑک بنی ہوئی تھی لیکن وہ ملک اور زمین ہی ایسی تھی کہ عمدہ اور ہموار سڑک بن ہی نہیں سکتی تھی۔ پہاڑیوں اور ندیوں' نالوں سے ہوکر سڑک جاتی تھی۔ کسی جگہ ایک میل بھی سڑک ایسی نہیں تھی جس میں گڑوں اور بانسوں کی چڑھائی اور اترائی نہ ہو۔ شکرم کا بے تکلف دوڑائے جانا ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔

ایک جگہ کچھ آبادی نظر آئی۔ یہ ضلع سیوتی تھا۔ کچھ دیر یہاں ٹھہر کر پھر آگے بڑھ گئے۔ پھر ایک ضلع دیولا پار آیا۔ یہ ضلع بھی پچھلے ضلع کی طرح بے رونق اور کم آباد تھا البتہ جب ان کی شکرم ضلع کانپتی سے گزری تو کچھ رونق نظر آئی۔ کانپتی نام کے مشہور دریا کے کنارے یہ بستی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر چھاؤنی اور انگریزوں کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ خشک سالی کی وجہ سے یہ دریا بھی پیاسا پڑا ہوا تھا۔

وہ اب تک سات چوکیوں سے بیل بدل چکے تھے۔ اب آخری اور آٹھویں چوکی دھومان تھی۔ ایک بجے کے قریب ان کی شکرم وہاں پہنچی۔

چوکی سے کچھ فاصلے پر ایک ڈاک بنگلا بنا ہوا تھا۔ سید احمد خوش ہوگیا کہ کچھ دیر یہاں آرام کریں گے لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کوئی انگریز اور اس کی فیملی وہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ سامنے ایک درخت تھا۔ یہ سب اسی کے نیچے بیٹھ گئے۔ بازار سے دودھ منگوا کر پیا۔ ڈاک بنگلے کے خانساماں سے ایک مرغی مول لی اور چھجو نے اس کے ساتھ مل کر قورمہ پکایا۔ خانساماں نے اپنے گھر سے پراٹھے پکوا کر دے دیے۔ شکرم والا جلدی کررہا تھا لہٰذا کھانے کا سب سامان لے کر شکرم میں بیٹھ گئے۔ شکرم چلتی رہی اور سب مل کر کھانا کھاتے رہے۔

خدا خدا کرکے یہ اذیت ناک مگر دلچسپ سفر ختم ہوا اور شکرم نے انہیں ناگپور پہنچادیا۔ تین دن اور تین رات برابر سفر کرنے کے بعد ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی لیکن بمبئی پہنچنے کی جلدی تھی لہٰذا صرف ایک رات کے آرام کے بعد ساتویں تاریخ کو آٹھ بجے دن وہ بمبئی جانے کے لیے ریل پر سوار ہوگئے۔

ریلوں کی حالت اور محکمے کا انتظام دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ یوپی میں اس نے جو گاڑیاں دیکھی تھیں' یہ ایکسپریس ٹرین اس سے کہیں بہتر تھی۔ ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں جانے کے لیے بیچ میں دروازہ تھا۔ ہر ڈبے میں ایک چھوٹا سا کمرا جائے ضرور کا اور منہ دھونے کا تھا اور پمپ کے ذریعے برابر پانی آرہا تھا۔ ان گاڑیوں میں تیسرے درجے کے علاوہ چوتھا درجہ بھی تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لیے بنچیں نہیں ہوتیں' اسی لیے اس کا کرایہ بہت کم تھا اور اس میں بہت لوگ سفر کررہے تھے۔

ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑا اور جوں جوں آگے بڑھنے لگی' انگریز انجینئروں کی قابلیت کا سکہ اس کے دل پر جم گیا۔ وہ ان کی عقل اور قابلیت پر حیران ہوتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ ریل کی پٹڑی پہاڑوں میں سے ہوکر گزر رہی تھی۔ بیسیوں فٹ کا ڈھلاؤ اور اونچان نیچان تھا۔ ایک مقام پر بہت دور تک ساٹھ فٹ طول میں ایک فٹ کے حساب سے ڈھلاؤ تھا۔ اس کے باوجود ٹرین کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آرہا تھا۔ بے تکلف اتر' چڑھ رہی تھی۔ کبھی گول چکر کھا کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھی' کبھی سانپ کی طرح بل کھا کر لہرا رہی تھی۔ پھر یہ

اولیائے کرام کی سوانح نگار ضیا تسنیم بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ

عظمت کے مینار

قیمت ۱۵۰/ روپے

اولیائے کرام جو مینارۂ رشد ہدایت ہے
ضیا تسنیم بلگرامی نے انہیں اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔

اُن دنوں جب ہر طرف حرص و طمع، عیش کوشی، خود غرضی اور نفسا نفسی کا دور دورہ تھا۔ انسان دُنیا داری، جاہ طلبی اور جاہ پرستی میں مبتلا تھا۔ روشنی کے ان میناروں نے انسانیت کو نجاتِ ابدی کی راہ دکھائی۔ دُکھی انسانوں کی راہ نمائی کی اور اُن کے کام آئے۔

عظمتوں کے ان میناروں کے کارنامے

اُن کی منوّر زندگی آج بھی ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ وہ ہم میں موجود نہیں لیکن اپنے کام میں موجود..... ہمیں بتاتے ہیں کہ دُنیا سائے کی طرح ہے۔ اس کے پیچھے بھاگو گے تو یہ آگے ہی آگے رہے گی۔ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا لیکن اگر اس سے بھاگو گے تو یہ تمہارے پیچھے دوڑے گی۔ ایک ایسی چیز جو سائے کی طرح ہو، اس کے پیچھے بھاگنے سے کیا حاصل؟

سلام کے خاموش مبلغوں کے پُر اثر واقعات

کہانیوں سے زیادہ دلچسپ داستانوں سے زیادہ اثر انگیز

مصنفہ کی ایک اور کتاب روشنی کے مینار بھی دستیاب ہے

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ سعید منشن لیبریا سٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

سانپ بل میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک لمبی سرنگ تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سرنگوں سے گزرنے کے بعد ایک طویل سرنگ آئی جو دو میل تک اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔ بے تکلف ایک ٹرین آتی اور ایک جاتی تھی۔ یہ سب اس کے لیے اتنا نیا تھا کہ یہ چیزیں اسے انسانوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نہیں لگتی تھیں۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہوئی۔ کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ یہ بلگام اسٹیشن تھا۔

"ریل والو! بہت ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ پینے والو! پانی پیو' بہت ٹھنڈا پانی ہے۔"

اس نے آواز پر آنکھ جمائی۔ تین برہمنوں کو دیکھا جو مسافروں کو پانی پلا رہے تھے اور آوازیں لگا رہے تھے۔

ان برہمنوں کے برتن نہایت اچھے اور صاف تھے۔ معلوم ہوا جیون رام جادوا سیٹھ ساکن کا مپٹی کی طرف سے یہ انتظام ہے۔ پھر یہ سبیلیں جنہیں یہاں سب "پو" کہہ رہے تھے' اسے ہر اسٹیشن پر ملیں۔ جہاں کسی مہاجن نے انتظام نہیں کیا تھا' وہاں دکانداروں نے چندہ جمع کرکے سبیلیں قائم کردی تھیں۔ ان کاموں میں ہندو پیش پیش تھے۔ اسے مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہونے لگا کہ ایسے خدمت خلق کے کاموں سے ہمارے لوگ کتنی دور ہیں۔ یوپی کے کسی اسٹیشن پر ایسا انتظام نہیں ہے۔

اس کی ٹرین اسٹیشنوں اور سبیلوں سے گزرتی ہوئی "بائی کلا" اسٹیشن پہنچ گئی۔ وہ ناگپور سے ساتویں اپریل کو آٹھ بجے دن روانہ ہوا تھا۔ آٹھویں تاریخ کو دوپہر بمبئی پہنچ گیا۔

تمام مسافر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ایک اسٹیشن پہلے یعنی بائی کلا پر اترتے ہیں کیونکہ یہاں سے شہر اور ہوٹل قریب پڑتے ہیں۔ یہ بات اسے پہلے ہی بتادی گئی تھی اور اس کے دوستوں کو اسے لینے یہیں آنا تھا۔ وہ بھی اسی اسٹیشن پر اترا۔

اسٹیشن پر اس کے مہربان دوست مسٹر نوروز جی پارسی اور مرزا احمد علی بیگ موجود تھے۔ نوروز جی نے اس کا اسباب ایک آدمی کے حوالے کیا اور چھکڑے پر لاد کر ہوٹل روانہ کردیا۔ دو گھوڑوں کی نہایت شاندار پالکی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

"تشریف رکھیئے۔"

اس پالکی گاڑی نے انہیں پالن جی کے ہوٹل پہنچادیا۔ یہ نہایت بڑا اور عمدہ ہوٹل تھا۔ فرش فروش سے آراستہ۔ سونے کے لیے عمدہ پلنگ اور پردے دار مسہریاں لگی ہوئی۔ ہر کمرے میں گیس کی روشنی۔ عیسائی اور ہندوستانی خدمت گار۔ جدید تہذیب کے جلوے اس کی آنکھوں کے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ جبل پور سے یہاں تک کی تھکن یوں اتر گئی جیسے منڈیر سے دھوپ اترتی ہے۔

دو کمروں میں چار پلنگ ان کے لیے آراستہ تھے۔ یہ سب انتظام نوروز جی نے پہلے ہی کردیا تھا۔

سید احمد' حامد اور مرزا خداداد بیگ دو گھوڑوں کی گاڑی میں شہر کی سیر کو روانہ ہوئے۔ دکانیں سجی ہوئی' سڑکیں صاف جیسے ابھی ابھی کوئی دھوکر گیا ہے۔ کہیں کہیں انگریز میمیں چھتری لگائے چلی جاتی تھیں۔

ایک بھرے ہوئے بازار میں گنیش داس کشناجی کی دکان تھی۔ وہ دکان میں گیا اور ان کے گماشتوں کو ہنڈی دے کر روپے طلب کئے۔ روپے فوراً ہاتھ میں آگئے۔ ایک آدمی کو ان کے ساتھ کیا کہ وہ انہیں پی اینڈ او کمپنی جہاز کا دفتر بتادے۔

ایک بڑی عمارت میں اس کمپنی کا دفتر تھا۔ یہاں سے انہیں جہاز کا ٹکٹ خریدنا تھا۔ منیجر نے ان سے جہاز کا کرایہ اور اس ریل کے ٹکٹ کے پیسے لیے جو سوئز سے اسکندریہ تک پڑے گی' ان سے لیا۔

شام کے وقت سید احمد' محمود اور مرزا خداداد بیگ پھر سوار ہوئے اور بھنڈی بازار میں مرزا محمد علی بیگ صاحب سے ملنے گئے۔

محمد علی بیگ کے ساتھ وہ ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھ گئے۔ کتابیں بھی دیکھتے رہے اور بازار کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ وہاں ایک بزرگ میرا شرف علی نام کے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑی دیر سے وہ سید احمد کے چہرے میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا۔

"آپ کا وطن شریف کیا ہے؟"

"دہلی۔"

"ارے! آپ دہلی سے آئے ہیں۔ پھر تو آپ سید احمد کو بھی جانتے ہوں گے۔ اس نام کے ایک صاحب دہلی میں تھے۔ انہوں نے ایک کتاب آثارالصنادید بھی لکھی تھی۔ اب وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟"

"نہایت خوش ہیں اور آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔"

وہ اتنے خوش ہوئے کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں "میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اور بہت سوں کی طرح یہ بھی غدر کے ہنگامے میں مارے گئے۔"

بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بہت دیر تک ریاضی اور نقہ

پر باتیں کرتے رہے۔ باتیں تو اور بھی ہوتیں لیکن قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ اشرف صاحب نماز کے لیے اٹھے اور اسے بھی دعوت دی۔ وہ اور سید محمود اس وقت ترکی لباس میں تھے۔ اگر وہ اس لباس میں یوپی کے کسی شہر میں ہوتا تو اچھا خاصا تماشا بن جاتا۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچا کہ ان کی وضع قطع لوگوں کو عجیب سی لگے گی لیکن نماز کے لیے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اور محمود مسجد چلے گئے جو نواب کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب سی خوشی ہوئی۔ بہت سے لوگ ترکی ٹوپی پہنے بیٹھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اکثر ترک اس مسجد میں آجاتے ہیں۔ ان لوگوں نے انہیں بھی ترک سمجھا ہوگا۔

نویں اپریل کو وہ چاروں پھر بمبئی کی سیر کو نکلے۔ سب سے زیادہ تعجب انہیں ان اومنی بسوں کو دیکھ کر ہوا جنہیں کہیں دو کہیں تین گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ یہ دو منزلہ بسیں تھیں۔ اوپر نیچے چوبیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اسی بس میں بیٹھ کر وہ اپنے دوست سہراب جی سے ملنے قلعہ محلّہ میں واقع ان کی کوٹھی پر گیا۔

”سرسید کے روپ میں قوم کو ایک جن مل گیا تھا جو اس کے لیے چشم زدن میں ہروہ کام کردیتا تھا جو برسوں میں ثروت و حکومت کے سہارے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہیں غیروں کے حملوں کی روک تھام کی جارہی ہے، کہیں اپنوں کے دماغ سے اوہام کے جالے صاف کیے جارہے ہیں۔ کہیں ملک کی مجالسِ قانون ساز میں قومی مفاد کے حصول کے لیے تگ ودو کی جارہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ غرضیکہ ترقی و تربیت کا ایک معرکۂ عظیم ہے۔ جس کے مختلف محاذوں پر بہ یک وقت یورش بھی جاری ہے اور دفاع بھی اور بڈھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں شمشیرِ عمل لیے ہر مورچے پر مثل برق پہنچتا اور مثال ابر گرجتا ہے۔“

(صلاح الدین احمد)

ان کی کوٹھی اور خاص طور پر پارسیوں کی ترقی دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ بمبئی کے پارسیوں نے بہت ترقی کرلی تھی۔ تمام پارسی ایک وضع کی پوشاک پہنے ہوئے ملے۔ تجارت اور نوکروں کے لیے دور دراز کے سفر سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کی لڑکیوں میں تعلیم عام تھی۔ ہر پارسی انگریزی جانتا تھا۔ اسے اپنی قوم کی بے حسی پر غصہ آنے لگا۔ دوسری قومیں ترقی کرتی جارہی ہیں اور ہم وہیں کے وہیں ہیں۔

سہراب جی نے تجویز پیش کی کہ سمندر کی سیر کی جائے اور بڑودہ جہاز کو دیکھا جائے جس پر سوار ہوکر انہیں انگلستان جانا تھا چنانچہ وہ سب میزیگان بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ دخانی جہاز دو میل کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے دو روپے کرائے پر ایک بوٹ لی اور سمندر میں قدم رکھا۔

ہوا ملائم اور موافق تھی لیکن کشتی ایسی ہلکی تھی کہ ہچکولے کھارہی تھی۔ ملاح نے بادبان کھولا اور کشتی کو موافق ہوا کے دھارے پر چھوڑدیا اور فی الفور جہاز تک پہنچادیا۔

تین سو نو فٹ لمبا، اڑتیس فٹ چوڑا اور چھبیس فٹ گہرا یہ جہاز سمندر کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ انسانی عظمت کا شاہ کار، انگریزوں کی ترقی کا رازدار۔

ایک سیڑھی کے ذریعے وہ جہاز کے اندر پہنچے۔ جہاز کے کمرے کسی شاہی محل کی طرح آراستہ تھے۔ عمدہ میزیں اور کرسیاں۔ جابہ جا شیشے کی جڑی ہوئی لالٹینیں اور چھوٹے چھوٹے آراستہ کمرے، ضروری سامان سے سجے ہوئے تیار۔

یہاں بہت سے چیزیں ایسی تھیں جو اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ خاص طور پر یہاں کے غسل خانے جن میں ٹب رکھے ہوئے تھے اور پیتل کے نل۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ان ٹبوں میں بیٹھ کر نہاتے ہوں گے۔ اس سے زیادہ تعجب اسے شاور دیکھ کر ہوا۔ سہراب جی نے اسے دکھانے کے لیے دیوار میں لگی ٹونٹی کو گھمایا اور شاور کی چھلنی سے پانی، بارش کی طرح برسنے لگا۔

”واہ صاحب، گھنٹوں کھڑے ہوکر نہایئے اور بارش کا لطف لیجیے۔ ہم تو انگریزوں کے ایک غسل خانے جتنی ترقی بھی نہیں کرسکے۔“

جہاز کی چھت دیکھ کر اسے اپنے نانا کی حویلی یاد آگئی جہاں وہ بچپن میں دور تک دوڑتا تھا اور نہیں تھکتا تھا۔

اس چھت پر ایسے پردے لگے ہوئے تھے جو سورج کے ساتھ ساتھ گھومتے تھے اور بیٹھنے والوں کو دھوپ سے بچاتے تھے۔ رات کے وقت یہ پردے ہٹادیے جاتے تھے۔

”کیسا پُرفضا مقام ہے۔ رات کے وقت یہاں سے سمندر کی سیر، چاندنی کا پھیلاؤ اور ٹھنڈی ہوا کیسا لطف دیتی ہوگی“ سید احمد نے کہا۔

"آپ یہاں سے سمندر کا نظارہ کریں گے تو بے شک اپنے آپ کو بہشت میں پائیں گے" سہراب جی نے کہا۔

"سنتے ہیں دنیا فانی ہے لیکن ہمارے لیے تو یہ بہشت فانی ہوگی۔ انگلستان پہنچتے ہی یہ بہشت ہم سے چھن جائے گی۔"

"اس وقت آپ اس بہشت سے بڑی بہشت میں پہنچ چکے ہوں گے" سہراب جی نے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

تھوڑی دیر کی سیر کے بعد پھر اسی بادام کے چھلکے جیسی کشتی پر سوار ہو کر شہر آنے کا ارادہ کیا لیکن واپسی میں ہوا مخالف تھی۔ ظالم ملاح نے منع کرتے کرتے بھی بادبان کھول دیا۔ کشتی اور سمندر میں ٹھن گئی۔ کشتی بجائے ساحل کے سمندر کی طرف چلی۔ سب لوگ اس طرح جھٹکے کھا رہے تھے جیسے کوئی جامنوں کو برتن میں رکھ کر ہلاتا ہے۔ ہوا کے صدمے سے کشتی لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی۔

"کہاں لیے جاتا ہے؟"

"تھوڑی دور اور چلو۔"

وہ یہی کہتا رہا اور سمندر میں کئی میل آگے لے گیا لیکن آدمی ہوشیار تھا۔ کسی نہ کسی طرح کشتی کو گھاٹ پر لگا دیا۔

جہاز کی روانگی دسویں اپریل کو تھی۔ وہ دو بجے دن میزیگان بندرگاہ پر آئے۔ چھوٹا سا بوٹ موجود تھا جو تھوڑے تھوڑے لوگوں کو جہاز تک پہنچا رہا تھا۔ وہ بھی اس بوٹ کے ذریعے جہاز تک پہنچ گئے۔ انہیں ان کے کمرے میں پہنچایا گیا جسے سب کیبن کہہ رہے تھے۔ اس میں چار پلنگ، دو اوپر دو نیچے تھے بالکل ریلوے کی برتھوں کی طرح لیکن ان پر بستر اور تکیے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کھڑکی بھی تھی جو سمندر کی طرف کھلتی تھی۔

قریب چھ بجے شام جہاز نے لنگر اٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ سے زمین غائب ہوگئی۔ پانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پانی کے کنارے آسمان سے ملے ہوئے تھے اور آسمان کسی طشت پر پڑے ہوئے کپڑے کی طرح سمندر کو ڈھانپے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

فرسٹ کلاس میں سوا سو کے قریب پلنگ تھے لیکن صرف اڑسٹھ مسافر سفر کر رہے تھے۔ ان میں بھی سب کے سب انگریز اور ان کی میمیں تھیں جو سب کے سب سید احمد کے لیے اجنبی تھے لیکن سب نے انہیں دیکھ کر گڈ مارننگ کہا اور خیریت دریافت کی۔

رات کے کھانے کا وقت ہوا تو انہیں ایک لمبے کمرے میں پہنچا دیا۔ کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ ہر مسافر نے اپنے نام کا ٹکٹ جہاں وہ بیٹھنا چاہتا تھا، میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس عمل کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اس جہاز میں سفر ہے، ہمیشہ وہ جگہ اس کے بیٹھنے کے لیے مخصوص ہوگئی۔ کوئی اور وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی دن وہ شخص کھانے پر نہ آئے تو وہ جگہ خالی رہے گی۔

مسافروں کی تعداد کے مطابق چھری، کانٹے اور چمچے وغیرہ میز پر چنے ہوئے تھے۔ ان برتنوں کے ساتھ برانڈی، اور شیرے اور لال شراب پینے کے خالی گلاس بہ ترتیب لگائے ہوئے تھے۔ سید احمد نے چاروں گلاسوں کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور دوسرے گلاس پانی کے سمجھ کے اپنے سامنے رکھ لیے۔ ایک قسم کی شراب ویسے ہی گلاسوں میں پی جاتی ہے جیسا کہ پانی پینے کا گلاس ہوتا ہے۔ اسٹورڈ جو یورپین تھا، یہ سمجھا کہ یہ لوگ اسی قسم کی شراب پئیں گے جو اس گلاس میں پی جاتی ہے۔ وہ بھاگا ہوا گیا اور اسی قسم کی شراب کی بوتل لے آیا۔ سید احمد کی سفید، لمبی داڑھی دیکھ کر احتراماً سب سے پہلے اسی کے گلاس میں انڈیلی۔

"نو، نو... نو" سید احمد کو اتنی ہی انگریزی آتی تھی۔ اسٹورڈ نے اسی وقت ہاتھ روکا لیکن اب بھی یہ سمجھا کہ انہیں کوئی اور شراب چاہیے ہے۔ وہ مختلف شرابوں کے نام لینے لگا۔ مطلب یہ تھا کہ فلاں شراب لاؤں؟

"نو، نو۔ اونلی کولڈ واٹر" سید احمد نے کہا۔

اب وہ سمجھا، گلاس اٹھا کر لے گیا اور دوسرے گلاس اور برف کا پانی لے کر آگیا۔

کچھ تھوڑا سا کھایا تھا کہ جہاز کی حرکت سے جو تھوڑا تھوڑا کروٹ کے بل ہلتا تھا، سر کا بھیجا ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ جس کروٹ جہاز جھکتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر میں اس طرف کوئی نہایت بوجھل اور بھاری چیز آگئی ہے اور دوسری طرف سے سر خالی ہوگیا اور چونکہ یہ حرکت جہاز کی بہت جلد جلد ہوتی تھی اس لیے سر میں بھی یہ کیفیت بہت سریع پیدا ہو رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ یہ کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ اسی وقت اٹھ کر سب کے سب چھت پر چلے گئے۔ ذرا دیر ٹہلنے کے بعد اس کیفیت میں کچھ کمی ہوئی۔ سب سے زیادہ بُرا حال حامد اور محمود کا تھا۔ چار دن وہ جہاز کی چھت پر پڑے رہے۔ کھانے کے نام سے ابکائی آتی تھی۔

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو سید احمد کو اخلاق سے بعید معلوم ہوا کہ اس نے ابھی تک اپنے ہم سفروں سے راہ و رسم پیدا نہیں کی۔ وہ لوگ ہم ہندوستانیوں کے اخلاق کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔

مس کارپینٹر صاحبہ' جو نہایت نامی گرامی لیڈی تھیں اور جنہوں نے کلکتے اور بمبئی میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لیے بہت کوشش کی تھی' وہ بھی اسی جہاز میں تھیں۔ سید احمد کو اپنے قومی خدمت کے ذوق کی وجہ سے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ بڑے تپاک سے ملیں اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ وہ اردو نہیں جانتی تھیں اور سید احمد انگریزی سے واقف نہیں تھے۔ محمود نے اس گفتگو میں مترجم کے فرائض ادا کیے۔

ان کے پاس ایک کتاب تھی جس میں ان کی خدمات کے بارے میں ہندوستانی لوگوں کے خیالات درج تھے۔ انہوں نے سید احمد سے بھی درخواست کی اور انہوں نے بھی اس کتاب پر اپنی رائے اردو میں درج کی۔

وہ رات کے وقت جہاز کی چھت پر بیٹھا سیلی سیلی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ لیفٹیننٹ جے بی لارنس صاحب نام کا انگریز اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"تم لندن جاتے ہو؟"

"ہاں۔"

"لوگ کہتے ہیں دنیا میں تین مذہب سچے ہیں۔ ہندو' عیسائی اور مسلمان۔ کیا یہ بات تمہارے نزدیک بھی سچ ہے؟" اس انگریز نے پوچھا پھر خود ہی جواب دیا "میرے نزدیک تو صحیح نہیں کیونکہ صحیح مذہب صرف ایک ہی ہوگا۔"

"آپ نے درست فرمایا۔ متعدد مذہب جو مختلف اصول پر مبنی ہوں' سب صحیح نہیں ہوسکتے" سید احمد نے کہا۔

"میرے نزدیک عیسائی مذہب صحیح ہے" لارنس صاحب نے کہا۔

"ہر شخص اپنے مذہب کو ایسا ہی سمجھتا ہوگا" سید احمد نے کہا۔

اس نے کہا "اوروں کی سمجھ ٹھیک نہیں ہے۔"

سید احمد نے کہا "آپ کے خیال کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے اور آپ کس دلیل سے دوسروں کو غلط ثابت کرسکتے ہیں؟"

"دیکھو' عیسائی قوم نے کیا کچھ کیا۔ علم و ہنر جیسا ہمارے پاس ہے کسی کے پاس نہیں۔ ہم ہی کو خدا نے حکمت دی ہے۔ اس دخانی جہاز ہی کو دیکھو' کیا حکمت سے بنا ہے۔" انہوں نے اسی طرح کے اور کارنامے گنوائے۔

"یہ سب باتیں دنیا کے کاموں سے متعلق ہیں" سید احمد نے کہا "ان سے کسی مذہب کے سچے' جھوٹے ہونے کا کوئی تعلق نہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے نیک

"حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہوسکتا ہے تو یقیناً سرسید احمد خاں اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق' علم کا حامی' سوشل ریفارمر' پولیٹیشن' مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر اس عالم کا نہ تھا کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ اعلانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ سمجھے' اگر اس کی ساری دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے؟"

(پروفیسر آرنلڈ)

بندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں ذرا بھی جگہ نہیں دی۔"

وہ چپ ہوگئے۔ سید احمد نے سمجھا اب بات ختم ہوئی لیکن وہ بحث کرنے پر تلے ہوئے تھے "اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ بہشت کا ملنا صرف جیسس کرائسٹ یعنی حضرت عیسیٰؑ پر بھروسا رکھنے پر منحصر ہے۔"

"صاحب' میں کہہ چکا کہ ہر شخص اپنے مذہب پر ایسا ہی اعتقاد رکھتا ہے" سید احمد نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا تم بھی حضرت محمدؐ پر ایسا ہی بھروسا رکھتے ہو جیسا کہ میں حضرت عیسیٰؑ پر رکھتا ہوں۔"

"ہاں۔"

"نہیں!" انہوں نے کہا "تمہیں بھروسا نہیں اس لیے کہ تمہارے لہجے میں مضبوطی نہیں۔"

"اس لیے مضبوطی نہیں کہ ہم مسلمان صرف خدا پر بھروسا رکھتے ہیں اور اس کو پوجنا جیسا کہ ہمارے پیغمبر نے بتایا اور کوئی رستہ نہیں۔"

یہ سن کر وہ انگریز چپ ہوگیا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اٹھ کر نہیں گیا تھا بلکہ خفا ہو کر گیا تھا۔ اس لیے کہ دوسرے دن سید احمد نے اسے گڈ مارننگ کہا تو اس نے جواب نہیں دیا۔

چند دن میں اس جہاز پر کئی انگریزوں سے اس کی دوستی

ہوگئی اور وقت اچھا کٹنے لگا۔ چند پارسیوں اور بوہریوں سے بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی جن سے اردو بولنے کا لطف آتا تھا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک بادبانی جہاز بمبئی کی طرف جارہا ہے۔ بڑودہ جہاز پر فوراً ایک جھنڈا بلند ہوگیا۔

معلوم ہوا جب دن کے وقت کوئی جہاز نظر آتا ہے تو پھریرا بلند کیا جاتا ہے اور چونکہ ہر قوم کے جہازوں کے پھریرے علیحدہ علیحدہ رنگ کے ہیں اس لیے معلوم ہوجاتا ہے کہ کس کا جہاز ہے۔

رات کے وقت ایک دخانی جہاز ملا۔ کپتان نے فی الفور دو مہتابیاں جن میں ایک قسم کی آتش بازی تھی منگائی۔ اس مہتابی میں سرخی مائل روشنی تھی اور پھر سفید رنگ کی مہتابی چھوٹی۔ اس کے بعد نیلے رنگ کی مہتابی چھوڑی گئی۔

یہ آتش بازی یونہی نہیں چھوڑی جارہی تھی بلکہ یہ جہازوں کے آپس میں بات چیت کرنے کا طریقہ تھا۔

دوسرے جہاز نے پوچھا تھا کہ جہاں ہم ہیں وہاں کا عرض بلد کیا ہے۔ بڑودہ جہاز نے جواب دیا کہ عرض بلد ہے سترہ درجے دقیقے اور طول بلد ہے پینسٹھ درجے پانچ دقیقے۔

جہاز میں ٹھیک راستہ چلنے کے لیے متعدد قطب نما لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ کپتان یا افسر اور دوسری جگہ کوارٹر ماسٹر دن رات برابر کھڑے رہتے ہیں اور ہردم قطب نما کے درجے دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر ذرا بھی جہاز کا رخ پھرا اور قطب نما سے معلوم ہوا۔ اسی وقت کپتان نے جہاز کو پھروایا اور صحیح سمت پر لے آیا۔

چھ دن اور چھ راتیں اسی طرح پانی پانی میں چلے گئے۔ تب ۲۹ اپریل کو نمازِ فجر کے وقت عرب کی مقدس سرزمین دکھائی دی۔ اسی تاریخ کو عدن کے قریب کے پہاڑ دکھائی دیے۔ جہاں سے پہاڑ شروع ہوئے تھے وہاں ایک مینار روشنی کا بنا ہوا تھا تاکہ جہازوں کو پہاڑوں کے قریب آنے سے روکا جائے۔

تھوڑا دن نکلا تھا کہ جہاز نے عدن کے کنارے کو سلام کیا اور لنگر انداز ہوگیا۔

جب جہاز لنگر کرچکا تو سید احمد اپنے بیٹوں اور خدمت گاروں کے ساتھ ایک کشتی کے ذریعے کنارے تک آگیا۔ ساحل پر دو گھوڑوں کی بگھیاں فٹن، گھوڑے، گدھے اور خچر کرائے کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے فٹن اور ایک بگھی کرائے پر لی اور عدن کی سیر کو روانہ ہوگئے۔

یہاں کے حوض بہت مشہور تھے لہٰذا سب سے پہلے وہ ان حوضوں کو دیکھنے کے لیے گئے۔ دامنِ کوہ میں چھوٹے اور بڑے نو دس حوض تھے جو پہاڑوں کو کھود کر بنائے گئے تھے۔ ایک حوض سب سے بلند جگہ پر، دوسرا اس سے نیچے جگہ میں، تیسرا اس سے نیچی جگہ میں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ تمام حوض تھے۔ جب بارش ہوتی ہے تو پہلا حوض بھرتا ہے، پھر اس کا پانی ابل کر دوسرے حوض میں جاتا ہے پھر تیسرے میں۔ اس طرح دسوں حوض بھرجاتے ہیں۔

عدن سمندر کے کنارے پر ہے اس لیے جہاں کنواں کھودا جاتا ہے، کھارا پانی نکلتا ہے لہٰذا عرب کے بادشاہوں میں سے جو قبل از اسلام ہوئے ہیں، کسی بادشاہ نے بارش کا میٹھا پانی جمع کرنے کے لیے یہ حوض بنوائے تھے۔

سرکاری انگریزی نے ان حوضوں کی نہایت عمدہ مرمت کرادی تھی۔ خوبصورت کیاریاں بنا کر اور بینچیں ڈال کر تفریح گاہ کی صورت دے دی تھی۔

ان حوضوں کی سیر کرنے کے بعد سیر کرنے کو بازار میں آئے۔ کئی دکانیں بھٹے والوں کی تھیں جو کوئلوں پر بھٹے بھون کر بیچ رہے تھے۔ ان بھٹوں کو دیکھ کر ہندوستان یاد آتا تھا۔ اس یاد کو یادگار بنانے کے لیے انہوں نے بھی بھٹے خریدے اور کھاتے ہوئے چلے۔ ایک دکان سے روٹی خریدی ایک سے سالن۔ ایک نانبائی پراٹھے پکار رہا تھا۔ اس سے پراٹھے پکوائے۔ یہ سب چیزیں لے کر ایک مسجد میں بیٹھ گئے۔ اس میں سے کچھ کھایا، کچھ بانٹا۔ ایک آدمی پانی بیچ رہا تھا اس سے تین پیسے کی ایک صراحی خریدی جس میں سے بہ مشکل تین گلاس پانی نکلا۔ معلوم ہوا پانی یہاں بہت مہنگا ہے اور برف تو نام کو بھی نہیں ملتی۔

بازاروں میں سمالی قوم کے لوگ کثرت سے ملے۔ یہ لوگ عربی بول رہے تھے مگر ایسی خراب کہ سوائے دوچار لفظوں کے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ اردو سمجھنے والے یہاں بھی تھے۔

جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو ایک ہندو پر نظر پڑی۔ اس ہندو کا یہاں ہونا بھی تعجب کی بات تھی لہٰذا سید احمد اس کے قریب پہنچا۔

"تم یہاں کیسے؟"

"میں بمبئی کا رہنے والا ہوں۔ یہاں مہاجنی کی دکان کرتا ہوں۔"

"یہاں اور بھی ہندو ہیں؟"

"بہت کم۔ لیکن ایسے بہت ہیں جو تجارت کی غرض سے

آتے جاتے ہیں۔ انہوں نے یہاں مہادیو اور ہنومان کے مندر بھی بنادیے ہیں۔"

عدن میں صفائی نام کو نظر نہیں آتی تھی۔ تمام دکاندار نہایت میلے کچیلے تھے خصوصاً سمالی تو بالکل وحشی معلوم ہورہے تھے۔ نان بائیوں اور قہوے والوں کی دکانیں تو ایسی میلی اور خراب تھیں کہ پاؤں رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

عدن کی انگریز چھاؤنی اور قلعہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ قلعہ دیکھ کر انگریزی گورنمنٹ کی قوت کا اثر دل میں ہوتا تھا۔

ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے عدن کی فوجی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہندوستان میں کوئی فساد برپا ہوتو صرف چھ دن میں بھاری سے بھاری فوجی سامان ہندوستان پہنچایا جاسکتا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے یہاں کی چھاؤنی کو بے حد ترقی دی تھی۔

انگریزوں سے پہلے عدن میں سلطان روم کی عمل داری تھی۔ انگریزوں نے اس کی فوجی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر قبضہ کرلیا۔

عدن سے ملی ہوئی سلطان روم کی عملداری تھی۔ عدن کے نیچے سمندر میں ایک کونا زمین سے نکلا ہوا تھا جس پر سے سلطان روم کی عمل داری شروع ہوتی تھی۔ گورنمنٹ انگریزی نے اس مقام پر دیوار بناکر آمدورفت کا رستہ بند کردیا تھا اور اس دیوار پر برج بناکر مورچا بندی کردی تھی۔ توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور گورے پہرا دے رہے تھے۔ اس دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے سے لوگوں کی آمدورفت تھی لیکن سلطان روم کی عمل داری سے جو شخص عدن میں آتا تھا تو ہتھیار لے لیے جاتے تھے۔ کوئی ہتھیار بند اندر نہیں آسکتا تھا۔

سترھویں اپریل، قریب پانچ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور سوئز کی راہ لی۔

شام سے خبر گردش میں تھی کہ جہاز "باب المندب" سے گزرے گا۔ یہ کوئی خطرے کی جگہ تھی اس لیے بعض لوگ خوف زدہ بھی تھے۔ سید احمد کو بھی اشتیاق ہوا کہ دیکھا تو جائے کہ یہ جگہ ہے کیا اور جہاز کو کس طرح کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ اس نے شام ہی کو کئی لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر اس کی آنکھ لگ جائے تو اسے اٹھادیں۔

اس رات جہاز پر بہت کم لوگ سوئے۔ زیادہ تر لوگ اس خطرے کے گزرجانے کا انتظار کررہے تھے۔ سید احمد کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا اور جہاز کی پچھلی نصف چھت ان مسافروں کے لیے مخصوص تھی۔ یہ چھت اسی جہاز کی بہشت تھی لہٰذا وہ زیادہ وقت اسی بہشت میں گزارتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک بینچ پر بیٹھا سمندر کی ہوا سے لطف اندوز ہورہا تھا کہ باب المندب کا شور مچا۔

دو پہاڑوں کے درمیان سے جہاز کو گزرنا تھا۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ تھا۔ راستہ اتنا تنگ نہیں تھا کہ خطرے کی کوئی بات ہوتی۔ شاید پانی کے نیچے دونوں طرف پہاڑ ہوں اور اس سبب سے جہاز کے چلنے کا راستہ تنگ ہو۔ کسی خطرے کا احساس بھی نہیں ہوا اور فرفر جہاز گزرتا چلا گیا۔ ممکن ہے بادبانی جہازوں کو یہاں خطرہ ہوتا ہو۔

ابھی رات گزری نہیں تھی کہ یہ جہاز ایک چھوٹے سے جزیرے "پیرم" سے گزرا۔ یہ جزیرہ اسی آبنائے میں ہے جس سے بحرعرب اور بحراحمر ملتا ہے۔ یہ جزیرہ ایک میل سے بھی کم چوڑا اور ڈھائی تین میل لمبا ہے۔

اس جزیرے پر انگریزی حکومت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس قبضے کی کہانی اسے اس کے ایک انگریز دوست نے سنائی۔

"انگریزوں سے پہلے اس پر کسی کا قبضہ نہیں تھا۔ لوئیس نپولین فرانس کے بادشاہ نے ایک جہاز بھیجا کہ اس بالشت بھر کے جہاز پر قبضہ کرلو۔ وہ جہاز عدن تک آیا اور رات کو لنگر ڈالا کہ صبح کو اس جزیرے پر قبضہ کریں گے۔

عدن میں جو انگریزی افسر تھا، وہ رات کو جہاز میں فرانسیسی افسر سے ملنے آیا۔ بات چیت ہوئی۔ کھانے پر بیٹھے تو باتوں باتوں میں فرانسیسی افسر نے اپنا ارادہ اور آنے کی وجہ بیان کی۔ انگریزی افسر نے یہ سنتے ہی اپنی پاکٹ میں سے پنسل اور ایک ٹکڑا کاغذ کا نکالا اور اس پر لکھا، فی الفور انجن میں آگ جلاؤ اور جہاز تیار کرو۔ یہ پرچہ اس نے میز کے نیچے ہاتھ کرکے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے دخانی جہاز کے کپتان کو دے دیا۔ یہ کپتان اس کے ساتھ آیا تھا۔

انگریزی افسر خود وہیں بیٹھا رہا جبکہ کپتان اٹھ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کھانے پینے کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس نے بھی گڈنائٹ کہا۔ فی الفور اپنے جہاز میں آیا اور اسی وقت روانہ ہوکر رات ہی کو جزیرے پر انگریزی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا۔

++++++++++++++++++++++

ماخذات

حیاتِ جاوید۔ سرسید نمبر، رسالہ نگار۔ مسافرانِ لندن۔

صبح کو فرانسیسی افسر جہاز لے کر پہنچا، دیکھا کہ جزیرے پر انگریزی جھنڈا اڑ رہا ہے۔

بائیسویں تاریخ رات کے وقت یہ سب اپنے اپنے پلنگوں پر سو رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس وقت تند ہوا چلی، کب سمندر میں موجیں اٹھیں اور بپھرا ہوا، غصے میں بھرا ہوا سمندر کا پانی کھڑکی کے ذریعے کمرے میں آگیا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلے۔ اس وقت تک تمام انگریز بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ جہاز کے ملازمین اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ جلدی جلدی تمام کمروں کی کھڑکیاں بند کی گئیں۔ معلوم ہوا سمندر میں طوفان آگیا ہے۔

ہوا دم بہ دم تیز ہوتی جاتی تھی۔ جہاز کبھی اٹھتا تھا کبھی بیٹھتا تھا۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ جی متلاتا تھا مگر قے نہیں ہوتی تھی۔ یہ خوف الگ تھا کہ نہ جانے جہاز کا کیا حشر ہو۔ سمندری طوفانوں کے عجیب عجیب قصے سن رکھے تھے۔

دن چڑھے تک جہاز کی یہی کیفیت رہی۔ بالآخر جہاز اور طوفان کی یہ لڑائی ختم ہوئی۔ سمندری طوفان گزر گیا اور سب نے شکر ادا کیا۔

طوفان سے گزرنے کے بعد سمندر میں "گنگا اسٹیمر" دکھائی دیا۔ پہلے دونوں جہازوں میں جھنڈی سے صاحب سلامت ہوئی، پھر آپس میں باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی۔

پہلے سید احمد کا یہ خیال تھا کہ چند باتیں جو خاص جہاز کے متعلق ہوں گی، انہی کے اشارات مقرر ہوں گے اور مختلف رنگ کی جھنڈیوں سے ایک دوسرے کا مقصد سمجھ لیتے ہوں گے لیکن معلوم ہوا کہ یہ لوگ چند کپڑوں کے ٹکڑوں کے وسیلے سے تمام دنیا کی باتیں کرسکتے ہیں، ہنسی مذاق کرسکتے ہیں، لطیفے سنا سکتے ہیں۔ امریکا اور یورپ کی قوموں کے سوا اور کسی قوم میں یہ فن نہیں تھا۔

۲۳ویں اپریل ۱۸۶۹ء کو یہ بڑودہ دخانی جہاز صبح سات بجے سوئز پہنچا۔ جہاز نے لنگر کیا۔ اس کے بعد کا سفر ریل کے سپرد تھا اس لیے سید احمد نے اس جہاز کو خدا حافظ کہا اور اپنے ساتھ آئے ہوئے چار آدمیوں کا قافلہ لے کر سوئز ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہاں سے عمل داری وائسرائے مصر کی شروع ہوتی تھی اس لیے انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی عبارتیں نظر آرہی تھیں۔

یہ ہوٹل نہایت عالی شان تھا۔ چاروں طرف دو منزلہ مکانات اور کمرے مسافروں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ بیچ صحن میں شامیانہ کھنچا تھا اور پورے صحن کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ جو جگہ پھولوں سے بچ گئی تھی اس میں میزیں اور کرسیاں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے لگادی گئی تھیں۔

ہوٹل کے باہر بہت سے گدھے زین کسے موجود تھے جو لوگوں کو نہر سوئز دکھانے کے لیے کرائے پر چلتے تھے۔ یہ بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔ گدھے والے انگریزوں کو دیکھتے ہی شور مچاتے تھے "ڈنکی سر۔ ویری گڈ ڈنکی سر!" یعنی صاحب گدھا، صاحب بہت اچھا گدھا۔

سید احمد نے بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا لیکن اسے معلوم ہوا کہ ابھی پندرہ دن پہلے ہی وہ نہر کھد کر مکمل ہوئی ہے اور ابھی وہاں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں لہٰذا نہر سوئز کی سیر کے بجائے بازار کی سیر کو نکلے۔

ایک بہت چھوٹا اور تنگ بازار دیکھا۔ ہر قسم کے لوگ مصری، ترکی اور جرمنی اور یونانی دکاندار، دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ بیشتر لوگ عربی بول رہے تھے۔ اس لیے سید احمد کو خرید و فروخت میں نہایت آسانی پیش آرہی تھی۔ ترکی ٹوپیاں، چاقو اور عربی روٹی خریدی جو نہایت عمدہ تھیں۔

اس بازار کی خاص بات یہ تھی کہ پورا بازار لکڑی کے تختوں سے پٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے دھوپ بالکل بازار میں نہیں تھی۔

کچھ دیر بازار میں گھومنے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن دیکھنے گئے۔ یہاں کی زبان میں ریل کو "وابورالبر" کہتے تھے۔ یہ تمام ریل گاڑیاں برمنگھم کی بنی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں ہی سے کیا ہے، پمپ اور پانی دینے کے ستون اور ریل کی سڑک اور ہر قسم کی کلیں حتیٰ کہ لوہے کی ایک کیل بھی۔ تمام سامان انگلستان یا فرانس کا بنا ہوا تھا۔ کوئی چیز بھی مصر یا ترکستان کی نہیں تھی البتہ ریل چلانے والے سے چپراسی تک سب کے سب مصری اور ترک تھے۔

ایک کھڑی ہوئی گاڑی پر چڑھ کر ڈبوں کا جائزہ لیا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے بمبئی ٹرین سے اچھے تھے۔ سیٹوں پر چمڑے کی گدیاں لگی ہوئی تھیں۔ فرسٹ کلاس نہایت عمدہ اور آرام دہ تھا۔ ہر ڈبے میں آٹھ آدمیوں کی نشست تھی۔ چار ایک طرف چار ایک طرف۔ سونے کے لیے الگ انتظام نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس طرح سویا جاسکتا تھا جیسے آرام کرسی پر سولیا جائے۔

اب وقت تنگ ہونے لگا تھا۔ اسی اسٹیشن سے شام کی گاڑی سے اسکندریہ کی طرف روانہ ہونا تھا جس کے ٹکٹ جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل جاکر کچھ دیر آرام کرنا تھا اور پھر شام کو اسی اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ وہ واپسی میں دور ہی

دور سے بازار کو سلام کرتے ہوئے ہوٹل پہنچ گئے۔

انہوں نے سنا تھا کہ راستے میں ریگستان اور جنگل کے سوا کچھ نہیں۔ پانی بھی راستے میں نہیں ملے گا۔ اس لیے جب ہوٹل سے اسٹیشن پہنچے تو تین صراحیاں پانی کی خرید کر ساتھ لے لیں۔ خدمت گار چھجو سیکنڈ کلاس میں اور سید احمد اپنے بیٹوں کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوگئے۔ اب ٹرین اسکندریہ کی طرف بھاگ رہی تھی۔

طنطنا، کفرالزیات اور مختلف شہروں سے گزرتی ہوئی یہ ریل دریائے نیل کے پُل سے گزری۔ اس پل کی شہرت تو بہت تھی۔ پل مضبوط بھی معلوم ہوتا تھا لیکن خوبصورت نہ تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ نہایت بدصورت تھا۔

پُل اترنے کے بعد اس ریل نے دمنہور اسٹیشن پر قیام کیا۔ اس سے اگلا اسٹیشن اسکندریہ کا تھا۔ اسکندریہ سے کئی تاریخی یادیں وابستہ تھیں۔ سید احمد خوش تھا کہ اس شہر کو بھی اپنی آنکھوں میں محفوظ کرلے گا لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ جہاز کے مسافروں کو شہر کے اسٹیشن پر نہیں اترنے دیا گیا بلکہ بندر کے اسٹیشن پر اتارا اور اترتے ہی یہ مسافر پونا نامی جہاز پر چلے گئے۔ اسکندریہ صرف اتنا ہی نظر آیا جتنا جہاز سے نظر آسکتا تھا۔

سمندر کے کنارے پر بہت کثرت سے جہاز دخانی اور بادبانی اور چھوٹے بجرے کھڑے تھے۔ ایک جنگی جہاز فرانسیسیوں کا بھی کسی کام سے آیا ہوا تھا اور والئ مصر کی سواری کا دخانی جہاز بھی کنارے پر کھڑا تھا۔ سمندر کے کنارے پر ہی ایک بڑا مکان بھی بنا ہوا تھا جو والئ مصر کے آنے اور اترنے کے لیے تھا۔ ۲۴ویں اپریل کو قریب دوپہر یہ جہاز اسکندریہ سے مارسیلز کے لیے روانہ ہوا اور اس نے بحرِروم کو طے کرنا شروع کیا۔

یہ جہاز پہلے جہاز سے بھی عمدہ اور مستحکم تھا جسے چھ سو گھوڑوں کے زور کا انجن کھینچ رہا تھا۔ اس جہاز کے سو سے زیادہ ملازمین میں سے کوئی بھی کسی اور ملک کا نہیں تھا۔ سب کے سب یورپین تھے۔ بعض افسران تھوڑی بہت اُردو بولتے تھے البتہ فرانسیسی خوب جانتے تھے۔

پچھلے جہاز کے کچھ مسافر کسی اور طرف چلے گئے تھے لیکن چند مسافر جن سے سید احمد کی دوستی ہوگئی تھی مثلاً میجر ڈاڈ، میجر بنگٹن اور مس کارپینٹر اور میجر فریزر اسی جہاز میں سفر کررہے تھے لہٰذا سید احمد کے دل لگنے کا سامان موجود تھا۔

"اب آپ یورپ میں آپہنچے" پہلے ہی دن کھانے کے بعد میجر ڈاڈ نے سید احمد سے کہا۔

"ہاں، آج ہماری پہلی منزل یورپ کے ملک میں ہے۔"

سید احمد نے بشاشت اور نہایت اخلاق سے انہیں جواب دیا۔

"جی ہاں، اب آپ کے پیغمبر کا ملک چھوٹا اور کافروں کا ملک آیا" میجر ڈاڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سید احمد کو تعجب ضرور ہوا کہ ایسے عمدہ اور لائق آدمی کو ایسے لہجے میں گفتگو کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ اس نے اس طنزیہ لہجے کو برداشت کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "یوں نہ کہئے بلکہ یوں کہئے کہ اہلِ کتاب کا ملک آیا۔"

سید احمد بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ان صاحب کی طینت اور طبیعت کس قسم کی ہے۔ پھر یہ سوچ کر ذہن کو جھٹک دیا کہ اس میں کسی تعصب کو دخل نہیں ہوگا۔ اتفاقیہ طور پر ان کی زبان سے نکل گیا ہوگا۔

ایک دن نہیں گزرا تھا کہ سید احمد کی ملاقات ایک مسلمان آیا نصیباً سے ملاقات ہوئی جو مسز کوپر ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے ساتھ اس جہاز میں سفر کررہی تھی۔

سید احمد اس آیا سے کھڑا باتیں کررہا تھا کہ میجر ڈاڈ بھی وہاں آگئے۔ سید احمد اس وقت اس آیا سے پوچھ رہا تھا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ اس آیا نے کہا، مسلمان۔

ڈاڈ صاحب نے یہ سنتے ہی سید احمد سے کہا "تمہاری قوم؟"

دوسرے لفظوں میں وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ دیکھ لو، تمہاری قوم کے لوگ ایسے معمولی درجے کے ہوتے ہیں۔

"ہاں بے شک ہماری قوم!" سید احمد نے خوش دلی سے جواب دیا "ہاں، بے شک ہماری قوم، ہماری قوم۔ بلاشبہ تمام انسان ہمارے نسلی بھائی ہیں۔ اس لیے کہ ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور سب مسلمان ہمارے مذہبی بھائی ہیں جو ایک خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے لیکن سید احمد کو کچھ سوچنے پر مجبور کرگئے۔ یہ لوگ یورپ میں داخل ہوتے ہی مصلحتوں کو الگ رکھ کر وہ کہنے لگے ہیں جو ان کے دلوں میں ہے۔

جلد ہی ایک اور واقعہ بھی ظہور میں آگیا۔ مس کارپینٹر کو اپنے بارے میں لوگوں سے رائے لکھوانے کا شوق تھا۔ وہ اس وقت میجر جنرل بنگٹن سے اپنی کتاب پر رائے لکھوا رہی تھیں۔

انہوں نے ہندوستانیوں کے بارے میں اپنی رائے لکھی۔

"احسان فراموش اور بے ہمت۔"

میجر بنگٹن نہایت بشاشت سے ہندوستانیوں سے ملتے

تھے مگر ان کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے کیا بات سمائی ہوئی تھی۔

پے درپے ہونے والے ان واقعات سے سید احمد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب نتیجے ہیں اس بات کے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں ملاپ نہیں۔ ہندوستانی بھی ان انگریزوں کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دونوں غلطی پر ہیں۔

اس نے انگریزوں کی طرف سے دل بُرا نہیں کیا بلکہ اسے اپنے سفر کی افادیت پر یقین مزید مستحکم ہوگیا اور اسے یقین ہوگیا کہ وہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان سے دوری کی جس دیوار کو ہٹانے کے لیے کام کررہا ہے' یہ کام غیر مناسب نہیں۔ کوئی کتنی ہی مخالفت کرے' وہ اس راہ سے نہیں ہٹے گا۔

○☆○

اسکندریہ سے چلنے کے بعد تین دن تک تو پانی کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن ستائیسویں تاریخ کو چار بجے کے بعد اٹلی اور سسلی کی زمین دکھائی دی۔ پھر جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے' عجیب عجیب شہر نظر آئے۔ دائیں ہاتھ کو اٹلی کا کنارہ تھا اور بائیں ہاتھ کو سسلی کا۔

جب یہ جہاز آبنائے مسینا میں سے گزرا تو دونوں کنارے ایسے پاس ہوگئے جیسے ابھی کوئی ہاتھ بڑھائے گا اور ایک ہاتھ اٹلی کے کنارے پر رکھ دے گا' دوسرے ہاتھ سے سسلی کو چھولے گا۔

آبنائے مسینا سے گزرتے ہوئے اس نے بہت چاہا کہ آتشیں پہاڑ اٹینا کو دیکھے مگر اس وقت دکھائی نہیں دیا۔ جب جہاز آبنائے سے باہر نکلا تو اٹینا سامنے آگیا اور دوربین کے ذریعے بخوبی دکھائی دیتا تھا مگر ان دنوں وہ روشن نہیں تھا۔

اٹلی اور سسلی کے بعض وہ شہر جو کناروں پر ملے سب کے سب انگریزی قطع کے نہایت خوبصورت شہر تھے۔ ان شہروں کا پہاروں کی ٹلہٹی اور چوٹی پر ہونا نہایت لطف دے رہا تھا۔ پہاڑوں کی قدرتی خوبصورتی ان شہروں کا سنگھار بن کر دیکھنے والوں کو قید کررہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر گرجا بنے ہوئے تھے۔

کنارے کنارے پہاڑوں کے تلے ریل کی پٹڑی آنکھیں بچھائے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ آہنی پل تھے۔ جابہ جا اسٹیشن بنے ہوئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جہاز سمندر سے نہیں' بازار سے گزر رہا ہے۔

مسینا جو سسلی کا دارالخلافہ تھا' نہایت عمدہ اور بڑا شہر تھا۔ سید احمد کا جہاز اس شہر کے اتنے قریب سے گزرا کہ پورا شہر صاف نظر آتا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ سسلی میں مدت تک مسلمانوں کی عمل داری رہی تھی مگر کنارے سے کوئی مکان مسلمانوں کی عملداری کا نظر نہ آیا۔ شاید سب نشان مٹ گئے تھے۔

اس سمندر میں ویل مچھلیوں کی ایسی کثرت تھی کہ جہاز کے مسافروں کے لیے تماشا سا ہوگیا تھا۔ دو دو تین تین مچھلیاں آپس میں کھیلتی ہوئی نکلتیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بلی کے بچے آپس میں اچھلتے کھیلتے ہیں۔ یہ مچھلیاں پانی میں چلنے والی کشتیوں کے عرض کے برابر موٹی اور اس کے طول کے برابر موٹی تھیں۔

ان کھیل تماشوں سے گزرنے کے بعد مارسیلز کی بندرگاہ آگئی۔ سمندر کے کنارے دیوار کھینچ کر بہت بڑا چبوترا بنادیا گیا تھا۔ یہاں پانی اتنا گہرا تھا کہ بڑے سے بڑا جہاز چبوترے کی دیوار تک چلا جاتا تھا۔ یہ جہاز بھی دیوار سے جالگا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ سید احمد نے بھی جہاز سے قدم اٹھاکر چبوترے پر رکھ دیا۔

تمام سامان اور بکس وغیرہ جہاز کی چھت پر پہلے ہی رکھ دیے گئے تھے اور ہر ایک کا نام اس کے سامان پر لکھ دیا گیا تھا۔ جہاز کے رکتے ہی فرانسیسی افسر (مارسیلز فرانسیسیوں کی عمل داری میں تھا) جہاز پر آگئے۔ تمام صندوق ان کے سپرد کردیے گئے۔ یہ صندوق فوراً کسٹم ہاؤس کے ایک بڑے کمرے میں پہنچادیے گئے اور مسافر ایک دوسرے کمرے میں جاکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں ایک پتلا سا دروازہ کھلا۔ یہ گویا کسٹم ہاؤس میں جانے کی راہ تھی۔ وہاں ان صندوقوں کو کھول کر تلاشی لی جاتی تھی کہ کوئی محصولی مال تو نہیں ہے مگر تلاشی میں نہایت نرمی برتی جارہی تھی۔ اکثر پوچھنے پر اکتفا کیا جارہا تھا کہ کوئی محصولی مال تو نہیں ہے۔

جب سید احمد کے سامان کی باری آئی تو مرزا خداداد بیگ اور چھجو تلاشی کے کمرے میں گئے۔

"پہننے کے کپڑوں میں کوئی محصولی چیز تو نہیں ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"کوئی محصولی چیز نہیں" مرزا خداداد بیگ نے کہا۔

"تمباکو تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ سامان لے جاسکتے ہیں۔"

اسی وقت قلیوں نے جو وہاں موجود تھے' ہاتھوں ہاتھ اسباب اٹھاکر باہر رکھ دیا۔

باہر نکلتے ہی چند اشخاص ان کے قریب آئے اور ان سے پوچھا کہ آپ کس ہوٹل میں جائیں گے۔

"ہوٹل دلوور" مرزا خداداد بیگ نے کہا۔

یہ سنتے ہی ان اشخاص میں سے ایک شخص آگے آیا جو ہوٹل دلوور کی نمائندگی کر رہا تھا۔

"تشریف لایئے" اس نے ایک اومنی بس کی طرف اشارہ کیا جو اسی ہوٹل کی تھی۔

تمام سامان اپنی سربراہی میں لدوایا۔ چند اور مسافر تھے جو اسی ہوٹل میں جانا چاہتے تھے' انہیں بھی بٹھایا اور منی بس بندرگاہ سے شہر کی طرف چلی۔

رات کا وقت تھا اور یہ پہلا یورپ کا شہر تھا جسے وہ دیکھ رہے تھے۔ محمود اور حامد کبھی اس کھڑکی میں جھانکتے تھے کبھی اس کھڑکی میں۔ کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ دیوالی میں جو روشنی ہندوستان میں ہوتی تھی' اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں تھی۔ دکانوں میں شیشوں کے دروازے اور شیشوں کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ تمام اسباب جو دکانوں میں سجا تھا' باہر سے نظر آتا تھا۔ دکانیں کیا تھیں' پھولوں کے باغ تھے۔

دکانوں میں لیمپ' فانوس اور جھاڑ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ سڑک پر نہایت نفیس لالٹینیں گیس کی روشن تھیں۔ رات میں دن نکلا ہوا تھا۔ حیرت اور تحیر کے سوا ان میں سے کسی کی آنکھ میں کچھ نہیں تھا۔ ہندوستان میں کسی امیر کا دولت خانہ بھی ایسا آراستہ نہیں ہوگا جیسا یہ بازار تھا۔

اسی بازار میں دو تین مکان ایسے نظر آئے جو سب سے زیادہ آراستہ تھے۔ ان کے دروازے کیا' چھتیں بھی شیشے کی تھیں۔ نہایت نفیس چینی کے گملوں میں طرح طرح کے درخت اور پھول اور بیل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ نہایت نفیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک میز لگی ہوئی تھی۔ عورتیں اور مرد ان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

سید احمد کا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت بڑی شادی ہے۔ لوگ جمع ہیں اور مکان آراستہ ہے لیکن اس کی یہ غلط فہمی اسی وقت رفع ہوگئی جب ایک واقف حال نے بتایا کہ یہ عام لوگوں کے شراب پینے کے لیے شراب خانے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی شراب خانے یہاں ہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ عام لوگوں کو یہاں تک کہ قلی اور مزدوروں کو بھی ایسی آراستگی سے شراب پینی میسر ہے کہ جمشید کو بھی میسر نہیں ہوئی ہوگی۔

یورپ کی ترقیوں پر رشک کرتے ہوئے وہ ہوٹل تک پہنچ گیا۔

رشک و حیرت کی جو کچھ کمی رہ گئی تھی' وہ ہوٹل پہنچ کر پوری ہوگئی۔ سات منزلہ اس ہوٹل میں بیضوی انداز میں اوپر تلے کمرے بنتے چلے گئے تھے اور صحن کے اوپر شیشے کی چھت تھی تاکہ پانی نہ آسکے صرف روشنی آئے۔

ان کے کمرے پانچویں منزل پر تھے۔ وہ ایک سو بیس سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ ہر جگہ گیس کی روشنی تھی اور ہر کمرا نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ ہوٹل کا نوکر انہیں اپنے اپنے کمروں میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔

نوکر کے جانے کے بعد اس کو چائے کی ضرورت ہوئی۔ اب نوکر کو کیسے بلایا جائے۔ کیا پھر اتنی سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا ہوگا پھر اسے یاد آیا' کسی نے اس سے کہا تھا' ولایت کے بڑے ہوٹلوں میں ایک کل لگی ہوتی ہے جہاں اس کو ہاتھ لگایا' گھنٹا بجا اور آدمی آیا۔ وہ اسی خیال میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نگاہ دیوار پر پڑی۔ وہاں ہاتھی دانت کا نہایت خوبصورت پھول لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا یہ وہی چیز ہے۔ وہ اس کے پاس گیا اور انگوٹھا لگا کر ذرا سا دبایا۔ ایک دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ نوکر حاضر ہوا۔ اس کو چائے کے لیے کہا جو وہ اسی وقت لے آیا۔

یہ خلجان اسے اب بھی تھا کہ اس نوکر کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ اسے کس کمرے میں بلایا گیا ہے۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ گھنٹی کے ساتھ ہی اس کمرے کا نمبر آجاتا ہے۔ یہ سب باتیں اس کے لیے بڑی نئی تھیں۔

شہر کی خوبصورتی نے ایک ہی رات میں اس کے دل کے دامن کو اس شوق سے کھینچا کہ صبح ہوتے ہی اس نے ایک گاڑی دو گھوڑوں کی منگائی اور پورے شہر میں گھومتا پھرا۔ ایسی وسیع اور عمدہ دکانیں دیکھنے میں آئیں کہ آنکھوں نے جنت میں قدم رکھ دیا۔ مٹی' تنکے یا کوڑے کا نام تک نہ تھا۔ تین لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ہر شخص بااخلاق' وضع دار ملا۔

اس نے عجائب گھر دیکھا' چڑیا گھر کی سیر کی' عظیم الشان گرجا گھر دیکھنے کے لیے پہاڑ پر چڑھا۔ پہاڑ سے شہر کا نظارہ کیا۔ یہ منظر بھی دیکھا کہ فٹن اور چیرٹ بے تکلف پہاڑ پر چڑھتی ہیں اور بہ آسانی نیچے اتر جاتی ہیں۔

رات ہوئی تو روشنیوں کی آتش بازی دیکھنے وہ پھر شہر کے آنگن میں آگیا۔ اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ زندگی میں کبھی اتنی روشنی دیکھے گا لیکن ان روشنیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دل میں اندھیرے اُتر رہے تھے۔ وہ

سوچ رہا تھا، ہم ان لوگوں سے کتنے پیچھے ہیں۔ کیا کبھی اتنی ترقی کر سکیں گے؟

ایک مکان بہت بڑا، ایسا ہی آراستہ نظر آیا جیسے اس نے شراب خانوں کے مکان دیکھے تھے۔ ہوٹل کا کمشنر جو اس کے ساتھ تھا، اس نے بتایا کہ یہ کزینو ہے یعنی ناچ گھر۔ وہ بھی وہاں گیا۔ دیکھا کہ سیکڑوں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ ہر کرسی کے سامنے چھوٹی سی میز ہے۔ کوئی چائے پی رہا ہے، کوئی کافی۔ کوئی شراب۔ سامنے شہ نشین بنی ہوئی ہے۔ اس میں ناچنے والیاں ہوش اڑانے کے لیے موجود ہیں۔ جو شخص چاہے، ٹکٹ لے کر اندر جائے۔ جب تک چاہے گانا سنے۔ ٹکٹ کی قیمت ہندوستان کے چھ آنے کے برابر۔ ناچ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی، تماشا دیکھ کر چلے آئے۔ ایسی کیفیت تو داستانوں میں بھی نہیں پڑھی تھی۔

یکم مئی کو اسی اومنی بس نے جو بندرگاہ سے ہوٹل لے کر آئی تھی، انہیں ریل کے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔

مارسیلز چھوڑنے کا بہت دکھ تھا لیکن جب ٹرین نے قدم اٹھایا۔ میدان، کھیت اور گاؤں آنکھ مچولی کھیلنے لگے تو ایک اور ہی عالم دکھائی دیا۔ سرسبزی، شادابی، ٹیلوں کی بلندی، درختوں کی اٹھان۔ چمن کے تختے، پھولوں کے گلدستے، مارسیلز اگر انسانی عقل کا کرشمہ تھا تو یہ مناظر قدرت کا سندیسہ تھے۔

عجائباتِ قدرت کو دیکھتے ہوئے جی نہیں بھرا تھا کہ لینز اسٹیشن آگیا۔ گاڑی سے اتر کر کچھ کھایا کچھ ساتھ لیا۔ کھاتے اور ہنستے بولتے ساری رات چلے۔

دوسری مئی کو صبح سات بجے پیرس میں داخل ہوئے۔ مارسیلز کی طرح یہاں بھی ہوٹلوں کے کمشنر موجود تھے اور ایک ایک سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں رہنا پسند کریں گے۔ سید احمد نے ہوٹل میورس کا انتخاب کیا۔

میورس ہوٹل کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ یہاں زیادہ تر انگریز ٹھہرتے تھے اور عملہ انگریزی جانتا تھا۔ اس کے سوا یہاں کوئی خوبی نہیں تھی۔

"کسی اچھی جگہ لے چلو۔" سید احمد نے ہوٹل کے کمشنر سے کہا۔

"میں آپ کو وارسیل لیے چلتا ہوں۔ ہر مہینے کے پہلے اتوار کو کھلتا ہے اور آج خوش قسمتی سے اتوار ہے۔"

سید احمد نے سوچا، یہ جگہ ضرور اچھی ہوگی۔ اسی لیے تو مہینے میں صرف ایک بار کھلتی ہے۔

کمشنر نے بھی زور دے کر کہا کہ نہایت عمدہ جگہ ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

یہ سب لوگ اس کے ساتھ پیدل ہی چل پڑے۔ سفر کی تھکن ابھی اتری نہیں تھی اور وہ تھا کہ چلا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک عمارت کا بڑا دروازہ آیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کمشنر نے کہا، آپ ٹھہریں، میں ٹکٹ لے آؤں۔ انہوں نے سوچا وہ جس مقام کے ٹکٹ لینے گیا ہے، وہی جگہ وارسیل ہوگی۔ وہ ٹکٹ لے آیا اور انہیں لے کر ایک دروازے میں داخل ہوگیا۔ یہ ریل کا اسٹیشن تھا اور ٹرین تیار کھڑی تھی۔ ٹرین دیکھ کر سید احمد کو سخت غصہ آیا۔ تمام رات ریل کا سفر کرتے چلے آئے تھے اور یہ شخص پھر ریل میں بٹھا رہا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کمشنر دوسرے درجے کے ٹکٹ لے آیا تھا۔

یہ دو منزلہ ریل تھی۔ نیچے فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھتے تھے اور اوپر سیکنڈ کلاس کے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چھت پر بیٹھنا پڑے گا تو طبیعت اور بھی مکدر ہوئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ تیس میل جانا ہے تو برداشت نے جواب دے دیا۔ وہ ٹرین سے اترنے کا ارادہ کر ہی چکا تھا کہ انجن نے سیٹی بجادی۔

غرض یہ راستہ طے ہوا اور وہ وارسیل پہنچ گئے۔ اسٹیشن سے تھوڑی دور جا کر ایک دروازہ ملا جو بند تھا مگر اس کے کواڑ جالی دار تھے جس میں سے اندر کی سب چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ اندر مکانات، باغ، نہریں، حوض اور فوارے تھے۔

"یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، فرانس کے سابق بادشاہوں کے محلات ہیں۔ سب اسی طرح مرتب اور آراستہ ہیں جس طرح کبھی تھے۔" کمشنر نے بتایا "ایک زمانے میں یہاں صرف میدان تھا۔ شہنشاہ لوئی سیزدہم ایک شکار کے پیچھے دوڑا اور تنہا یہاں تک نکل آیا۔ بہ مشکل ایک جھونپڑی ملی۔ وہاں جا کر ٹھہرا۔

یہ جگہ اسے اتنی پسند آئی کہ اس نے یہاں ایک چھوٹا محل بنایا۔ شہنشاہ چہارم نے یہاں ایک اور محل بنایا اور ۱۶۸۲ء میں اس نے یہاں دربار کیا۔

کمشنر ابھی کچھ اور بتاتا کہ دروازہ کھل گیا۔ جتنے لوگ باہر جمع تھے، اندر جانے لگے۔ سید احمد بھی اپنے چھوٹے سے قافلے کے ساتھ اندر گیا۔

حوضوں، نہروں اور فواروں کی خوبصورتی ایسی تھی کہ جنت زمین پر اتر آئی تھی۔ یہ چمن بندی اس نے قلعہ دہلی میں بھی دیکھی تھی لیکن یہ وہ کاریگری تھی جو انگلیوں سے نہیں، عقل سے ہوتی ہے۔

باہر کی سیر کرتے ہوئے یہ سب اندر محل میں داخل

ہوئے۔ محل کی خوبصورتی اور کمروں کی تقسیم نہایت عمدہ اور عجیب تھی۔ سب سے زیادہ متاثر کن وہ تصویریں تھیں جو بے نظیر مصوروں کا شاندار کارنامہ تھیں۔

ایک کمرا تصویر خانہ سلطنت کے نام سے تھا۔ اس میں تیرہ کمرے اور شامل تھے اور ان کمروں میں ایک سو تیس تصویری کارنامے پورے قد کے بنے ہوئے بس منہ سے بولنے کے لیے تیار تھے۔ نپولین کی فتوحات کی تاریخ تھی جو یہ تصویریں سنا رہی تھیں۔ اسی طرح دوسرے بادشاہوں کے کارنامے تھے۔

محل سے واپس آئے تو تھکن کا نام بھی کسی کی زبان پر نہیں تھا۔ رات ہوتے ہی بازار کی سیر کو نکل گئے۔ روشنی اتنی تھی کہ سوئی گر پڑے تو اٹھا لو۔

صبح ہوئی تو پیدل نکلے اور رمشیلو، ریولی، سینٹ ہونور، بازاروں کی سیر کی۔ پھر آن کر کھانا کھایا اور دو گھوڑوں کی گاڑی منگا کر پھر سوار ہوگئے کیونکہ وہ دو دن کے لیے پیرس میں ٹھہرے تھے اور ہر عمدہ مقام کو آنکھوں میں رکھ لینا چاہتے تھے۔

چوتھی مئی کو پونے آٹھ بجے پیرس سے روانہ ہوئے۔ اب اگلی منزل لندن تھی۔

کپتان جہاز نے ان کے ٹکٹ دیکھ کر انہیں اس بڑے کمرے میں جگہ دی جو فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے تھا۔

جب وہ اس بڑے کمرے میں داخل ہوئے تو عجیب تماشا دیکھا کہ ہر مسافر کے لیٹنے کی جگہ بنی ہوئی ہے اور تکیہ رکھا ہوا ہے اور ایک برتن چینی کا قے کرنے کو رکھا ہوا ہے۔ ہر مسافر اپنی جگہ پر لیٹا ہوا ہے بلکہ آنکھیں بند کرکے لیٹا ہوا ہے۔ تعجب خیز بات تھی کہ ایسا کیا ہونے والا ہے۔

یہ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا خداداد بیگ نے شیخی میں آکر قے کرنے کا برتن پرے ہٹا کر رکھ دیا۔

"اس جہاز کا عملہ تو کچھ زیادہ ہی محتاط ہے۔"

اتنے میں جہاز کھلا۔ کوئی سو گز چلا ہوگا کہ سب کا جی متلانے لگا۔ سب لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ اب معلوم ہوا کہ سب مسافر لیٹے ہوئے کیوں تھے۔

تھوڑی دیر بعد خداداد بیگ گھبرا کر اٹھے اور ابکائی لی اور قے کرنے کے برتن جسے پرے ہٹا دیا تھا ٹٹولنے لگے۔ ان کے قریب ایک میم صاحبہ لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ اس آدمی نے مجھ پر قے کی ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں اور نہایت مہربانی سے اپنا برتن اٹھا کر دیا۔ خداداد بیگ اسی گھبراہٹ کے عالم میں تھینک یو کہتے تھے۔ آدھا لفظ نکلا اور اوکر کے قے کی۔

محمود نے بھی قے کی۔ حامد کا جی بھی متلایا۔ سید احمد کا بھی یہی حال ہوا اور غفلت سی ہوگئی۔

دراصل اس سمندر کا پانی عجیب طرح سے حرکت کررہا تھا کہ خود بھی ہلتا تھا اور جہاز کو بھی ہلاتا تھا۔ اسی سے آدمی کو قے آتی تھی اور جی متلاتا تھا۔

اسی غفلت اور نیم بے ہوشی کے عالم میں خدا خدا کرکے رستہ طے ہوا، کنارہ آیا، ڈوور میں اترے اور ریل پر سوار ہوئے۔ سات بجے شام کے قریب چیرنگ کراس اسٹیشن واقع لندن میں اترے۔

اسٹیشن پر ان کے ایجنٹ میسرز ہنری ایس، کنگ اینڈ کو نے مسٹر اسٹار نام کے ایک آدمی کو اسٹیشن پر بھیج دیا تھا تاکہ وہ ان کی رہنمائی کریں اور انہیں آرام سے ہوٹل میں ٹھہرائیں۔ مسٹر اسٹار نے انہیں چیرنگ کراس ہوٹل میں ٹھہرایا۔

ان کے پاس اتنے روپے نہیں تھے کہ ہمیشہ ہوٹل میں ٹھہرے رہتے یا کوئی مہنگا مکان کرائے پر لے کر اس میں جا بسیں۔ یہ انہوں نے پہلے ہی معلوم کرلیا تھا کہ لندن میں لاجنگ کا طریقۂ کار بھی ہے یعنی جس مکان میں صاحبِ مکان رہتا ہے اسی میں سے چند کمرے وہ کرائے پر دے دیتا ہے۔ مکان کو اسبابِ ضروری سے، یہاں تک کہ سونے کے پلنگ، بچھونے سے مرتب کردیتا ہے۔ مکان والا لینڈلارڈ اور اس کی بی بی لینڈلیڈی کہلاتی ہے۔ کھانا بھی وہی پکوا کردیتی ہے، نوکروں کا بندوبست بھی وہی کرتی ہے۔ ہر ہفتے ایک بل دے کر جو خرچ ہوتا ہے، لے لیتی ہے۔

مسٹر جے لڈلم کے پاس ایک ایسا ہی مکان تھا اور وہ کسی معقول کرائے دار کی تلاش میں تھے۔ سید احمد میکلن برگ اسکوائر کے اس لاجنگ میں اٹھ آئے۔

وہ اس تذبذب میں تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ اسے رہنا پڑ رہا ہے، نہ جانے وہ کس قماش کے ہوں۔ گھر کا ماحول کیسا ہو۔ اس گھر میں رہ کر لکھنے پڑھنے کے مواقع میسر آتے بھی ہیں یا نہیں لیکن جے لڈلم اور ان کا گھرانا نہایت مہذب ثابت ہوا اور سید احمد کے دل پر یہ نقش ثبت ہوگیا کہ جب ایک متوسط طبقے کے فرد کا یہ عالم ہے تو اعلیٰ گھرانے کیسے شائستہ اور مہذب ہوں گے۔

اسے اس گھر میں رہتے کئی روز ہوگئے تھے لیکن ضرورت کے سوا کبھی کوئی اس کے سامنے نہیں آیا۔ سامنے

آنا تو بڑی بات کسی کی آواز بھی اس کے کمرے تک نہیں آئی۔ مسز لڈلم بھی ایسی ہی قابل اور تعلیم یافتہ اور شائستہ خاتون ثابت ہوئیں۔

لندن پہنچتے ہی اس نے عمائدین سے ملنے اور بڑی تقریبات میں مصروف ہوجانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ وہ عام لوگوں کے بارے میں اچھی طرح جان لے اور لندن کی عام حالت کا مشاہدہ کرلے کیونکہ کسی شہر کی تہذیبی ترقی کے لیے عوام کی حالت کے شعور سے بہتر کوئی اور راہ نہیں۔

وہ لندن پہنچنے تک جہاں جہاں سے گزرا تھا' جن واقعات سے دوچار ہوا تھا انہیں سفرنامے کے طور پر سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار کے لیے اشاعت کی غرض سے بھیج دیا کرتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ اس نے ان تحریروں کی اشاعت روک دی لیکن کبھی کبھی اپنے دوستوں کو خط لکھتے ہوئے اپنے دل کا درد کاغذ پر انڈیل دیتا تھا۔ ایسے ہی ایک خط میں اس نے اپنے مشاہدات اور نتائج کو تفصیل سے بیان کردیا۔ یہ اس کی ان کوششوں کا تذکرہ تھا جو اس نے لندن کو سمجھنے کے لیے صرف کی تھیں۔ اس نے لکھا۔

"یہ شہر بیس میل لمبا اور دس بارہ میل چوڑا ہے اور ۳۵ لاکھ آدمی کے قریب اس میں آباد ہیں۔ اگرچہ یہ شہر اپنی خوبصورتی میں پیرس سے بہتر نہیں ہے لیکن آبادی اور مال و دولت کی کثرت کے لحاظ سے دنیا میں کوئی شہر اس کی ہم سری نہیں کرسکتا۔"

آب رسانی کا نظام نہایت شاندار ہے۔ کوئی گھر اور کوئی موقع باقی نہیں جہاں نلوں کے ذریعے سے پانی نہ پہنچتا ہو۔ ایک مقام پر گھمادینے سے اس تمام علاقے کے گھروں کے حوض' پہلی منزل سے لے کر اونچی اونچی منزل تک سب بھرجاتے ہیں۔ جب سب حوض بھرجاتے ہیں تو وہ کل خودبخود بند ہوجاتی ہے اور پانی آنا بند ہوجاتا ہے۔

۱۸۲۱ء میں لالٹینوں کی روشنی سڑکوں پر شروع ہوگئی تھی جس نے اب وہ ترقی پائی ہے کہ ہر ایک گھر گیس کی صاف روشنی سے منوّر ہے۔

یہ قوم اپنے کارنامے ہی نہیں ایسے واقعات بھی یاد رکھتی ہے جن میں اس کے اور دوسروں کے لیے عبرت چھپی ہو۔ ایسی ہی ایک عمارت یہاں بنا ہوا ایک یادگاری مینار ہے۔ ۱۶۶۶ء میں اس شہر میں سخت آگ لگی تھی۔ تیرہ ہزار گھر جل کر خاک ہوگئے تھے۔ اس آتش زدگی کی یادگار میں ایک بہت بڑا مینار تیار کیا گیا ہے جو ۲۰۰ فٹ بلند ہے اور جس کو دیکھ کر لوگ اس بڑی مصیبت سے واقف ہوتے ہیں۔

ایک مشہور مکان ٹاور آف لندن بھی ہے۔ یہ لندن کا ایک قدیم قلعہ ہے۔ ۱۰۷۸ء میں بادشاہ ولیم اول نے اس میں ایک محل ویٹ ٹور کے نام سے بنایا۔ ملک الزبتھ اور کنگ جیمس کے زمانے تک وہ محل بادشاہوں کے رہنے کا مکان بنا رہا اور اس کے بعد سے قید خانہ ہوگیا اور بہت سی جانیں نہایت بے رحمی کے ساتھ اس میں ضائع ہوئیں۔ وہ لوہے کا تیر جس نے بڑے بڑے بادشاہوں اور سرداروں کی گردنیں کاٹی ہیں اور لکڑی کا کندہ جس پر وہ گردنیں کٹی ہیں' ٹاور کے اسلحہ خانے میں موجود ہے۔

یہاں کے تاجر نہایت خوش اخلاق ہیں۔ جب کوئی بازار میں جاتا ہے تو جس سوداگر کی دکان میں گزر ہوتا ہے' وہ سوداگر اس کے ساتھ نہایت اخلاق اور انسانیت سے پیش آتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوئی اس کو پسند کرلیا اور مالک دکان کو اس کی تفصیل اور مکان کا پتا لکھ دیا۔ نہ قیمت کی تکرار نہ سودا ٹھہرانے میں ناحق کی بک بک۔ تھوڑی دیر بعد اس سوداگر کا نوکر گاڑی پر سوار' ان سب چیزوں کو لیے ہوئے دروازے پر آموجود ہوتا ہے۔ بل پیش کرکے قیمت وصول کرلیتا ہے۔

یہ لوگ حد سے زیادہ راست باز ہیں۔ میں اکثر ایسے اشتہار دیکھتا ہوں جن میں لکھا ہوتا ہے' سونے کی گھڑی فلاں جگہ سے پڑی ہوئی ملی ہے اور اب وہ فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے۔ جس کی ہو وہ آکر لیوے۔

اس قوم کی تمام ترقی کا راز عمدہ تعلیم میں مضمر ہے۔ یہاں ہر شخص کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ تعلیم کا بے حد شائق ہے۔ کیب مین اور کوچوان تک اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں۔ جہاں فرصت ملی' اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کردیا۔ اب ان کا موازنہ ذرا بنارس کے یکّہ چلانے والوں سے کیجیے۔

یہاں کی نوکرانیاں تک ایسی ہیں کہ اگر وہ ہندوستان جاویں اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی بیگمات سے ملیں تو ان کو محض جانور سمجھیں۔ ان نوکرانیوں کو بھی مطالعے کا شوق ہے۔ قلتِ تنخواہ کے باوجود اخبار مول لیتی ہیں۔

تمام سودے والوں کی دکانوں پر ان کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام نوکرانیاں ہر ایک تحریر کو پڑھ لیتی ہیں اور جس مکان سے کام ہوتا ہے اسی میں داخل ہوتی ہیں۔

یہاں کے متوسط درجے کی عورتیں ایسی تعلیم یافتہ ہیں کہ جب وہ یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا

نہیں جانتیں تو ان کو تعجب ہوتا ہے۔

انگلستان کی اس تمام ترقی کا باعث یہ ہے کہ تمام علوم' تمام فن جو کچھ ہے' اسی قوم کی زبان میں ہے۔ ہندوستان کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ تمام علوم انہی کی زبان' میں دیے جاویں۔

ایک اور عجیب بات بتاؤں۔ یہاں ایسی علمی مجلسیں' مختلف مقامات پر' رات کے وقت منعقد ہوتی ہیں جو گورنمنٹ نے نہیں خود لوگوں نے قائم کی ہیں۔ ان میں شریک ہونے کے لیے دو' تین آنے فیس کے لیے جاتے ہیں۔ ان مجلسوں میں شریک ہونے والوں کے سامنے کیمسٹری' بیالوجی اور دوسرے علوم پر لیکچر دیے جاتے ہیں۔

فیس کی صورت میں ہونے والی آمدنی سے تمام اخراجات' لیکچر دینے والوں کی تنخواہیں وغیرہ سب خرچ نکل آتا ہے اور لوگوں کو ایسی تربیت پہنچتی ہے جو ہندوستان میں کسی بڑے فلسفی کو بھی نہیں پہنچتی۔

لندن میں صرف ناچ گھر ہی نہیں' ایسے علمی مکان بھی ہیں جہاں راتیں گزاری جاتی ہیں۔

یہ تمام نتائج ہیں زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کے اور تمام قوم کا ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا۔ اگر ہندوستان کے لوگ بھی تربیت پاجاویں تو انگلستان سے زیادہ نہیں تو یقینی اس کے قریب قریب پہنچ جاویں۔

وہ اس خط کو ختم کرچکا تو اس کا دل درد سے لبریز تھا۔ لندن کی ترقیوں کا بیان کرنے کے بعد اسے ہندوستان کی جہالت کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے اس کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا جو اس نے ایک دن پہلے ہی ایک جرمن کتب فروش سے دس گنا قیمت پر خریدی تھی۔ یہ ایک نایاب کتاب تھی جو ایک انگریز عالم نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی۔ یہ کتاب وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے حوالے کے طور پر خرید کرلایا تھا لیکن اس وقت سوچ رہا تھا کہ وہ اسے ہندوستان لے جائے گا اور اس کا ترجمہ اردو میں شائع کرائے گا۔ اسی وقت اس کی لینڈ لیڈی کی بہن جو ان دنوں بیمار تھی' اس کے کمرے میں آئی۔

"جو کتابیں آپ حال میں خرید کرلائے ہیں۔ ان میں سے کوئی مجھے دے دیجئے۔ لیٹے لیٹے پڑھتی رہوں گی۔"

"میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں جو آپ کے مطلب کی ہو۔ زیادہ تر مذہبی کتابیں ہیں اور وہ بھی جھگڑے کی۔"

"انہی میں سے کوئی دے دیجئے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔"

"میرے پاس اسلامی کتابیں ہیں۔"

"میں نے کہانا' کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی پڑھنا چاہیے۔"

اس نے ان خاتون کو ایک کتاب دے دی۔ ایک اور زخم دل پر لگا۔ ایک عورت بیماری کی حالت میں کتاب سے دل بہلا رہی ہے۔ اسے یہ بھی اعتراض نہیں ہے کہ یہ کتاب کسی اور مذہب کے بارے میں ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی حالت کیسی خراب ہے۔

○☆○

چھ مہینے بعد وہ ایک اور مکان میں منتقل ہوگیا۔ یہاں بھی وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر تھا لیکن یہ مکان بڑا تھا۔ اس کے چھ کمرے اس کے استعمال میں تھے۔ چار کمرے سونے کے لیے' ایک کمرا پڑھنے کا اور ایک سٹنگ روم یعنی ملاقات کا کمرا۔

دو نوکرانیاں بھی تھیں۔ جو لکھنا پڑھنا بخوبی جانتی تھیں۔ نہایت مؤدب اور مہذب۔

اب اسے لندن میں رہتے ہوئے اتنے دن ہوگئے تھے کہ اس کا تذکرہ لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں ہونے لگا تھا اور جو لوگ اس کے کام اور عزائم سے واقف تھے' اس سے ملنے کے مشتاق ہونے لگے تھے۔

ایک دن لارڈ لارنس اس سے ملنے کے لیے آئے۔ وہ ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ سید احمد اور اس کے خاندان سے واقف تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے اس کی وفاداریوں کے قصے بھی سنے تھے۔ نہایت مہربان' مروت اور خلق سے پیش آئے اور اپنے گھر ڈنر پر مدعو کیا۔

باوقار مردوں اور خوبرو لیڈیوں کا مجمع تھا۔ اس کے پہنچتے ہی زوردار تالیوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اکیلی میز پر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے لارڈ لارنس نے اسے مدعو کیا ہے لیکن انہوں نے تو پورے لندن کو جمع کرلیا تھا۔ تمام امرا اور مشاہیر موجود تھے۔

"آپ سے ملئے' آپ ہیں لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی۔ قسطنطنیہ میں بطور انگریزی سفیر رہتے ہیں۔ آج کل لندن آئے ہوئے ہیں۔"

"آپ ہیں سرجان ولیم کے انڈر سیکریٹری۔"

"یہ ہیں ملکہ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل۔"

"اور ان سے ملئے ملکہ معظمہ کے داماد مارکوئیس آف لارن۔"

کھانے کے بعد سول انجینئرز سوسائٹی کے صدر' مسٹر بن

اس کے پاس آئے۔

"ہماری سوسائٹی ایک جلسہ منعقد کر رہی ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔ اس تقریب میں آپ کو کچھ اور رزی وقار لوگوں سے ملنے کا موقع بھی ملے گا۔"

"میں اس دعوت کو اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں۔"

"میرا اسٹیمر آپ کو مقررہ تاریخ پر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے ملے گا۔"

اس نے دعوت قبول کرلی۔ یہ جلسہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۹ء کو منعقد ہونا تھا۔

اس نے اپنے دونوں بیٹوں سید حامد اور سید محمود کو بھی ساتھ لے جانے کی ٹھہرائی اور پارلیمنٹ ہاؤس تک جانے کی تیاری کرنے لگا۔

لارڈ لارنس نے سوچا ہوگا وہ پارلیمنٹ ہاؤس تک بھی اکیلے کیوں جائیں، وہ خود اس کے مکان پر آئے اور اپنے ساتھ سوار کرکے لے گئے۔ حامد اور محمود بھی ساتھ تھے۔

اسٹیمر میں جاکر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے جو بڑے بڑے کارخانے تھے ان میں مشینوں کے ذریعے ہونے والے جادوئی کارنامے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جاکر ڈنر کھایا۔

اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئرز شریک ہوئے۔ اس ڈنر کی خاص بات یہ تھی کہ تمیں طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے۔ خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہیں تھی۔

کھانے کے بعد تمام انجینئروں نے جو جلسے میں شریک تھے، تقریریں کیں اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا ذکر کیا۔

سید احمد کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھادیا گیا تھا کہ وہ تمام کارروائی ان کو اردو میں سمجھاتا جائے۔ اس لیے وہ ان تقریروں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

سب تقریروں کے بعد پریذیڈنٹ نے اسپیچ دی اور سید احمد کو "سیویر آف انڈیا" کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔

سید احمد کا ذکر انہوں نے ایسے الفاظ میں کیا تھا کہ ان کی تقریر کے بعد اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ بھی جواب میں کچھ کہے۔

ایک ایسے جلسے میں جہاں نامور انجینئرز جمع ہوں اور جلسے کا موضوع انجینئرنگ کے سوا کوئی اور مضمون نہ ہو، اس کا تقریر کرنا آسان نہیں تھا لیکن اس نے ایسا مضمون باندھا کہ سماں بندھ گیا۔

اس کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں لیکن وہ چیز جو خاص و عام سب کے دل میں عظمت پیدا کرنے کا باعث بنی وہ فن انجینئری کے نتائج ہیں۔ جیسے ریل، دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گزرتی ہے۔ ان چیزوں کو جو شخص دیکھتا ہے خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب اور اس کی بڑائی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

زوردار تالیوں کی گونج میں وہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔

۱۶ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف آرگائل کے ہاتھ سے ان کو سی ایس آئی کا خطاب اور تمغا ملا۔ اس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔

تاریخ معین پر وہ دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہوکر انڈیا آفس گیا۔ سرجان ڈبلیو کے انڈر سیکریٹری وزیر ہند اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ نہایت تپاک سے ملے اور اسے اپنے ہمراہ ایک کمرے میں لے گئے۔ ڈیوک آف آرگائل اس کے منتظر تھے۔ وہ چند قدم آگے بڑھے اور اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغا اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارک باد کہہ کر سید احمد کو رخصت کیا۔

اسی روز چار اور اشخاص کو بھی یہی تمغا ملنے والا تھا جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک نے کھانے پر بلایا۔ عمائدین اور پارلیمنٹ کے ارکان جمع تھے۔ سید احمد کو ڈیوک کے بائیں جانب بیٹھنے کا اعزاز ملا۔

حلقۂ رؤسا میں گزر ہونے لگا تو اس مشکل نے ہاتھ پھیلائے کہ ان حضرات سے ملنے کے لیے بھی جانا پڑا۔ چند ہی دن میں اسے اندازہ ہوگیا کہ لندن میں رہنا آسان ہے، سفر کرنا مشکل ہے۔ ملنے والوں میں سب امرا اور لارڈ ہیں۔ ان کی اپنی مصروفیات ہیں۔ کبھی ملتے ہیں، کبھی نہیں ملتے۔ سب عزت کی جگہیں تھیں اس لیے دو گھوڑوں کی بگھی ضروری تھی۔ کسی کے گھر آنے جانے میں دس روپے سے کم خرچ نہیں ہوتے تھے۔ رسم یہ تھی کہ جو آپ سے ملنے کے لیے آئے، آپ کو بھی وہاں جانا ضرور ہے۔ وہ اخراجات کی زیادتی سے پریشان ہوگیا تھا۔ صرف سواری کے خرچ کے ڈر سے بہت کم گھر سے نکلتا تھا۔

اس کی خوش قسمتی کہ ایڈورڈ طامس سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ یہ صاحب دلی میں سیشن جج رہ چکے تھے اور انہوں نے ہی آثارالصنادید کو دوبارہ لکھنے، ترمیم کی صلاح دی تھی۔ انہی کی کوششوں سے سید احمد کی تقرری مستقل جج کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہی کام آئے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ کسی کلب کا ممبر بن جائے۔

"یہ شہر تو مصروفیت کا کارخانہ ہے۔ یہاں کس کس سے ملنے جاتے رہوگے۔ یہ کلب ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ سب ایک جگہ جمع ہو کر ملاقاتیں کرلیں۔ نہ مہمان کو دقت ہو نہ میزبان کو صعوبت۔"

"کیا ایسی کوئی صورت ہے؟"

"لندن میں ایک نہایت نامی اور معزز کلب ہے "اے تھی نیم کلب" یہ ایسا نامی کلب ہے کہ اس کلب میں جو کوئی ممبر ہوتا ہے اس کے دوست اس کو مبارک باد کی چٹھیاں لکھتے ہیں۔ اس ممبر کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ کسی خطاب ملنے پر بھی کیا ہوگا" مسٹر طامس نے اسے بتایا "اس کلب کی اہمیت کا اس سے اندازہ کرلو کہ کوئی شخص جو صاحب تصنیف نہ ہو یا اور کسی کمال میں مشہور نہ ہو، وہ اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا۔ سیکڑوں آدمیوں کی درخواستیں آتی ہیں لیکن جب تک کوئی جگہ خالی نہیں ہوتی، اس کی درخواست پر غور نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی تین ہزار سے زیادہ امیدوار ہیں۔"

"پھر میں کس طرح ممبر بن سکتا ہوں؟"

"اعزازی ممبر ہونے کے لیے جگہ خالی ہونا شرط نہیں ہے۔"

ایڈورڈ طامس کی کوششوں سے اسے آنریری ممبر شپ مل گئی اور اس نے لندن کی وہ علمی مجلس دیکھ لی جو عام سیاح نہیں دیکھ سکتے۔

وہ دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر اے تھی نیم کلب پہنچ گیا۔

پال مال میں نہایت عالی شان دو منزلہ مکان تھا جس کے دروازے پر اے تھی نیم کلب کا نام سنہری حروف میں جگمگا رہا تھا۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک کمرا تھا جس میں فرش بچھا تھا اور دو تین کوچیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس کے کونے میں ایک اور چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا جس کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس چھوٹے کمرے میں منیجر بیٹھتا تھا۔ دیواریں شیشے کی اس لیے تھیں کہ جو شخص بڑے کمرے میں آئے، منیجر کو معلوم ہو۔

منیجر کے کمرے کے دائیں طرف نہایت وسیع کمرا تھا۔ نہایت عمدہ فرش سے آراستہ۔ عمدہ عمدہ کوچیں اور چوکیاں بچھی ہوئی۔ بیچ میں گول میز لگی ہوئی جس پر تمام دنیا کے اخبار رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جغرافیے کے نقشے اس حکمتِ عملی سے لگے ہوئے تھے کہ ایک ادنیٰ اشارے پر کھل جاتے تھے اور ادنیٰ اشارے پر لپٹ جاتے تھے۔

بہت سے لوگ اس وقت بھی اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ خاموش، تصویر بنے بیٹھے تھے۔ جو آتا ہے پاؤں کی آواز بھی نہیں نکالتا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا سید احمد کب اس کمرے میں آیا کب چلا گیا۔

اس کمرے کے پہلو میں لکھنے کا کمرا تھا۔ بیچ میں گول میز لگی ہوئی تھی۔ ہر قسم کا کاغذ اور متعدد قسم کے کاغذ اور لفافے رکھے ہوئے تھے۔ لکھنے کے خوبصورت مقام مہیا اور ہر جگہ دوات قلم موجود۔ جس ممبر کو کچھ لکھنا ہو اس کمرے میں جائے، کسی اور جگہ بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔

اس کلب میں خط کی روانگی کا بھی عجیب و غریب انتظام تھا۔ اس کام کے لیے ایک "نل" بنا ہوا تھا۔ چٹھی لکھی اور اس نل میں ڈال دی۔ وہ چٹھی منیجر کے پاس پہنچی۔ اس نے اس کا وزن کیا۔ ڈاک کے محصول کے ٹکٹ لگائے اور روانہ کردی۔

ایک وسیع کمرا ڈائننگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کھانے کے سامان سے آراستہ، تمام اشیا کھانے پینے کی موجود، خانساماں، خدمت گار، خوبصورت وردیاں پہنے ہوئے حاضر۔ ہر وقت ہر چیز موجود رہتی تھی۔

سگریٹ پینے کا کمرا الگ تھا۔ ہر جگہ بیٹھ کر سگریٹ نوشی نہیں کی جاسکتی تھی۔

اوپر کی منزل اس سے بھی زیادہ عجیب تھی۔ ایک کمرا تو صرف اس لیے تھا کہ وہاں جا کر ٹہل سکیں۔

یہاں کا کتب خانہ بھی گویا جنت کا گوشۂ خاص تھا۔ داروغۂ کتب اشارۂ ابرو دیکھنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ جو کتاب درکار ہوئی، فوراً میز پر آگئی۔

یہ کمرا کیا تھا، کسی بڑے مصور کی تصویروں کا البم تھا جس میں انسانوں کو تصویر بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ آواز دینی تو درکنار کھانسنا بھی نامناسب خیال کیا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے خیال اور اپنی دھن میں مصروف۔ بڑے بڑے عالم، دانش مند گونگے بنے بیٹھے تھے۔

ایک طرف لندن کے مشہور عالم ڈین اسٹانلے کچھ لکھنے میں مستغرق تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ سید احمد پر ڈالی اور اپنی

کرسی پر سے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور پھر چپکے سے بیٹھ گئے۔ نہ انہوں نے کچھ کہا نہ سید احمد نے۔

وہ اپنی دھن میں مگن ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ عقل حیران ہوتی تھی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

وہ کلب سے واپس آیا تو اسے پھر اپنا ہندوستان یاد آگیا۔ میں نے بھی علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے لیے عمدہ اور عالی شان مکان بنوایا۔ پھر اس سے کیا نتیجہ ہے؟ میں وہ آدمی کہاں سے لاؤں جو اپنے ملک، اپنی قوم کی بھلائی کے لیے ذرا بھی محنت اختیار کریں۔ مجھے تو ایسے آدمی بھی نہیں ملتے جو کچھ نہ کریں تو اپنی قوم کی حالت پر رو ہی دیں۔

○☆○

لندن آنے کے فوراً بعد ہی اس نے سرولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے حوالے کی کتب کی فراہمی کا کام شروع کردیا تھا۔ انڈیا آفس کا کتب خانہ چھان مارا۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سے اطلاعیں حاصل کیں۔ عربی کتابیں جو مصر، فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں، وہ منگوائیں۔ چند لاطینی اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں، بہت گراں قیمت پر لندن کے بازاروں سے خریدیں۔ ایک آدمی ملازم رکھا جو اسے لاطینی کتابوں کے ضروری حصے پڑھ کر سناتا تھا اور وہ نوٹس لیتا جاتا تھا۔

شب و روز کی محنت کے بعد اس نے کتاب کے ابواب تقسیم کئے، حوالوں کو ترتیب دیا اور لکھنا شروع کردیا اور اس سرگرمی کے ساتھ جیسے کوئی فرائض منصبی ادا کرتا ہے۔

وہ اس بات کی احتیاط رکھے ہوئے تھا کہ جب تک کتاب چھپ کر تیار نہ ہوجائے، ہندوستان میں اس تصنیف کی شہرت نہ ہونے پائے۔

اس نے صرف مولوی سید مہدی علی کو رازدار بنایا ہوا تھا۔ کتاب کے سلسلے میں پیش آنے والی ہر مشکل کے بارے میں انہی کو لکھتا تھا۔

"میں شب و روز تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑدیا ہے، کمر درد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب ادھر فکر جواب اعتراضات۔ کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی مشکل ہوگیا ہے۔"

"روپیا ہر روز صرف ہوتا جاتا ہے۔ کتبے کھدوائے ہیں۔ نقشہ جات جو استدلالات کتاب میں داخل ہوں گے، بنوائے ہیں۔ اس شخص کا بل آنے والا ہے جو انگریزی عبارت لکھتا ہے۔"

اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ جو کچھ لکھتا جاتا تھا، ساتھ ساتھ چھپواتا بھی جاتا تھا۔ یہاں بھی اس نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ایک لائق انگریزی داں ملازم رکھ لیا تھا جو اس کی تحریر کو انگریزی میں منتقل کررہا تھا۔ اور یہ انگریزی ترجمہ وہ چھاپے خانے کے حوالے کردیتا تھا۔

جیسے جیسے کتاب آگے بڑھتی گئی، اخراجات کے اندازے جو اس نے لگائے تھے، سب غلط ہوتے گئے۔ اندازے سے کہیں زیادہ خرچ ہونے کی توقع تھی۔ ابھی ایک ہی جلد کا کام مکمل ہوا تھا کہ اسے فکر ہونے لگی کہ لکھنا اور چھپوانا تو شروع کردیا، روپیا کہاں سے آئے گا؟

اس نے ہندوستان میں بیٹھے ہوئے دوستوں کو پکارا، ان سے چندے کی اپیل کی۔ کہیں سے جواب آیا کہیں سے نہیں۔ وہ بار بار اپنے دوستوں کو لکھتا رہا "میری یہ رائے ہے کہ سو سو روپے احباب سے چندہ لیا جائے۔ تیس آدمی جمع ہونے چاہئیں۔ تین ہزار سے کم خرچ نہیں ہونے کا۔"

وہ بڑی دل سوزی سے لکھتا رہا "اگر تمام روپیا خرچ ہوجائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہوکر مرا۔"

یہاں تک کہ ۱۸۶۹ء کے سال کا ستمبر کا مہینہ آگیا۔ اس کی دلسوزی بے کار گئی۔ احباب نے سنی ان سنی کردی۔ توجہ دی بھی تو اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح۔

اس نے پھر خط لکھا۔

"میری درخواست ہے کہ کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کردوں گا۔

میں نے دلی بھی خط لکھا ہے کہ میری کتابیں اور میرا اسباب یہاں کہ تک ظروفِ مسی تک فروخت کرکے ہزار روپے بھیج دو۔

اگر ہزار روپے مہاجن سے، ہزار دلی سے آئے اور پانچ چھ سو روپے چندے کے ذریعے جمع ہوگئے تو کتاب بخوبی چھپ جائے گی۔"

اسے یہ یقین تھا کہ جو کتاب اس نے تصنیف کی ہے، اس کے ہم قوم اس کی قدر نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافرومرتد بتلاویں گے کیونکہ کچھ مسئلوں میں اس نے جمہور سے اختلاف کیا تھا۔

"ہمارے شفیق تمام چیزوں کو چھوڑ کر انہی مسئلوں کی بدولت کفر کا فتویٰ دیں گے۔"

اسے یہ بھی یقین تھا کہ جتنا روپیا لگے گا' اس کی فروخت سے اس سے زیادہ وصول ہو جائے گا۔

اس لیے وہ چندے کی اپلیں کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرنے لگا کہ لندن ہی میں کسی بینک سے قرض لے لے۔

جب کتاب مکمل ہوگئی اور وہ دیباچہ بھی لکھ چکا۔ اب جو اندازہ چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ہوش جاتے رہے۔ چار ہزار کا خرچ آرہا تھا جبکہ ہندوستان سے جو چندے کی رقم آئی تھی وہ قریبًا سولہ سو تھی۔ لہٰذا یہ سوچے بغیر کہ ادا کہاں سے کرے گا' تین ہزار کا قرض لندن میں اپنے اوپر چڑھالیا۔

○☆○

جان ہالیٹ بٹن' سابق کمشنر آگرہ چند ہفتوں کے لیے کلفٹن میں جو برسٹل کے پاس ایک مقام تھا' ٹھہرے ہوئے تھے۔

سید احمد کی چونکہ ان سے پرانی دوستی تھی لہٰذا فورًا انہیں خط لکھا۔ ان کا جواب آیا کہ کوئی انگلستان آئے اور اس کے قصبے' گاؤں اور کھیت نہ دیکھے تو سیاحت کہاں ہوئی۔ ان چیزوں سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔

سید احمد نے ان کی دعوت قبول کی اور انہیں لکھ دیا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ان سے ملنے آرہا ہے۔

برسٹل' لندن سے جانبِ غرب ایک سو اٹھارہ میل دور اور برسٹل سے کلفٹن تین میل کے فاصلے پر تھا۔

سید احمد نے سوا دس بجے دن' پیڈنگٹن ریلوے اسٹیشن پر جا کر ٹکٹ لیے اور ساڑھے تین بجے برسٹل ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا۔ کلفٹن جانے کے لیے کیب اور گھوڑوں سے چلنے والی اومنی بسیں تیار کھڑی تھیں۔ اس نے کیب کرائے پر لی اور کلفٹن ہوٹل پہنچ گیا۔

اس کے پہنچنے سے پہلے بٹن صاحب نے اس کے لیے کمروں کا بندوبست کرادیا تھا۔

منیجر نے تین بیڈ روم نہایت آراستہ اور ایک ڈرائنگ روم۔ نفیس نفیس میزیں اور کرسیاں۔ قد آور آئینے اور جھاڑ' گیس کی روشنی کے لگے ہوئے تھے' تیار رکھے ہوئے تھے۔

چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ بٹن صاحب آگئے۔ کچھ دیر ساتھ رہے پھر یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ ڈنر ہمارے ساتھ کرنا۔

رات کو یہ تینوں بٹن صاحب کے گھر گئے۔ واپس آکر اسی آرام دہ ہوٹل میں سوگئے۔ دوسرے دن سر ایڈورڈ اسٹریچی جو برسٹل آئے ہوئے تھے' ان سے ملنے گئے۔ واپسی میں جنرل سرابراہیم رابرٹس کے سی بی کے گھر ان سے ملنے گئے۔ جنرل رابرٹس کو کابل اور غزنیں کی لڑائیوں کی وجہ سے تمام ہندوستان بخوبی جانتے تھے۔

"یہاں تک آئے ہو تو تمہیں سرولیم میلز کا مکان بھی ضرور دیکھنا چاہیے" لارڈ بٹن نے کہا۔

"اس مکان میں کیا خوبی ہے؟"

"یہاں کے امیروں اور متمول لوگوں کا یہ دستور ہے کہ اپنی سکونت کے لیے ایک مکان جنگل میں کسی عمدہ جگہ پر بناتے ہیں۔ انہوں نے یہ مکان کلفٹن کے قریب بنایا ہے۔"

"سرولیم میلز کون صاحب ہیں؟"

"ایک بڑے سوداگر ہیں۔"

وہ ان کے کہنے سے یہ مکان دیکھنے گیا اور یہ دیکھا کہ اگر یہ نہ دیکھا ہوتا تو کچھ بھی نہ دیکھا ہوتا۔

ایک نہایت وسیع احاطہ تھا۔ شاید پندرہ بیس مربع میل کا۔ اس میں ہر قسم کے خوشنما درخت لگے ہوئے تھے۔ چرند اور پرند جن کا شکار ہوتا ہے' اس میں مثلِ جنگل کے پھر رہے تھے۔

اس میدانی احاطے کے بیچ میں ایک نہایت عمدہ کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ ہر کمرا آراستہ تھا جیسے ابھی کوئی اٹھ کر گیا ہے۔ ایک وسیع کمرے میں کتب خانہ تھا۔ دل بہلانے کے لیے ایک کمرے میں عمدہ عمدہ باجے بھی تھے۔ ان کمروں میں نامور لوگوں کی تصویریں آویزاں تھیں جو تاریخی واقعات کی یاد دلاتی تھیں۔

برسٹل ہی میں اس نے' کلفٹن کی گھاٹیوں کے بیچ میں دریائے ایون کے اوپر ایک پل دیکھا جو اپنی مثال آپ تھا۔ دریا پر معلق لٹک رہا تھا حالانکہ سات سو فٹ لمبا تھا۔ کوئی دریا محراب یا پایہ اس کے بیچ میں نہیں تھا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس پل کو حکومت نے نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت بنایا ہے تو یہ پل اور بھی خوبصورت لگنے لگا۔ اسے اپنی قوم کی عادت یاد آنے لگی جو ہر بات میں حکومت کا منہ دیکھتی ہے۔

اسی پل کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑ تھا۔ وہاں ایک رصد خانہ مسٹروسٹ کی ملکیت تھا۔ وہ اسے بھی دیکھنے گئے۔ اس کی چھت پر ایک کمرا بنا ہوا ہے اور چھت کے بیچوں بیچ ایک شیشہ لگا ہوا ہے جو چاروں طرف پھرتا ہے۔ اسے جس طرف پھیرا جاتا تھا' اس طرف کے مکانات اور دریا اور جنگل اور آدمیوں کی تصویر کمرے میں آجاتی تھی۔ تمام آدمی چلتے پھرتے نظر آتے تھے یہاں تک کہ پہچانے جاتے تھے۔

سید احمد، حامد اور محمود بڑی دیر تک یہ تماشا دیکھتے رہے۔
وہ اس بات سے بھی متاثر ہوا کہ یہ تمام کارخانہ ایک عورت کے سپرد تھا اور وہی ہر عمل کر کے دکھا رہی تھی۔
اسی پہاڑ میں ایک غار تھا، نو فٹ گہرا اور آخر میں کچھ کچھ چوڑی جگہ تھی۔ یہ اس قسم کے غار ہیں جہاں کسی زمانے میں عیسائی درویش بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے اور شاید اسی سبب سے یہ پہاڑ سینٹ ونسینٹ کے نام سے مشہور تھا۔

چار دن کی سیر و تفریح کے بعد اس نے بٹن صاحب سے اجازت لی، ریل میں بیٹھے اور لندن آگئے۔

○☆○

اس کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' جو اس کے نزدیک اسلام کی بڑی خدمت تھی، جلد بندی سے تیار ہوگئی اور کتب فروش کی دکان میں فروخت کے لیے رکھ دی گئی۔ وہ دعا گو تھا کہ خدا کرے کچھ جلدیں بک جائیں تاکہ جو قرض ہے وہ اُتر جائے۔

○☆○

جب وہ ہندوستان سے چلا تھا تو اس کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا چنانچہ کتاب کے کام سے نمٹنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر دیکھا اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی، اس پر غور کیا اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشیں کرلیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا۔ تعلیم نسواں کو غور سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا، اس کو نگاہ میں رکھا۔
اپنے ان مشاہدات کی مدد سے ایک تعلیمی اسکیم بنائی۔ ہندوستان کی مروجہ انگریزی تعلیم سے اس کا موازنہ کیا اور لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے اور جو طریقہ تعلیم ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا اسے بیان کیا۔
مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تمام غور و فکر اس رائے پر آکر ختم ہوگیا کہ ہندوستان میں چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمڈن کالج یا محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی حالت درست کرنے کے لیے ایسوسی ایشن قائم کرنا یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی، ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بے کار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔
اس نے نہ صرف طے کرلیا کہ وہ ہندوستان جاکر تعلیمی جدوجہد میں مصروف ہوجائے گا بلکہ اپنے دوست مولوی مہدی علی کو لکھ بھی دیا۔
''اگر مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم ہوجائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں مگر بغیر دس لاکھ روپے نقد ہوئے ممکن نہیں ہے۔''
کتب خانوں کی چھان بین کے دوران میں اسے ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر نام کے دو رسالے ملے۔ یہ پرچے ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری ہوئے تھے اور ان پرچوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی تحریروں سے انگریزوں کے اخلاق، عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات میں انقلاب برپا ہوگیا تھا۔

ان پرچوں کی اشاعت کے وقت انگلستان کی معاشرتی حالت وہی تھی جس سے اس وقت ہندوستان گزر رہا تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ ایسا ہی ایک رسالہ خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کیا جانا چاہیے۔
اس کا یہ ارادہ اتنا پختہ تھا کہ ہندوستان آنے سے پہلے ہی اس کا نام ''تہذیب الاخلاق'' تجویز کرلیا مگر پیشانی پر چھاپنے کے لیے خوبصورت بیل بوٹوں کے بلاک بھی بنوا لیے اور کم از کم ایک برس کی اشاعت کے لائق کاغذ خرید کر بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کردیا تاکہ جب تک وہ پہنچے یہ کاغذ بھی وہاں پہنچ جائے۔
اس نے چاہا تو یہ تھا کہ سر ولیم میور کی کتاب چونکہ چار جلدوں میں ہے اس لیے جواب کے طور پر بھی چار جلدیں لکھی جائیں لیکن اخراجات کی زیادتی نے اسے مجبور کردیا کہ وہ ضروری باتوں کا جواب لکھ کر ایک ہی جلد میں کتاب ختم کردے۔

اسے امید تھی کہ اس کی یہ ایک جلد پر مشتمل کتاب بہت زیادہ فروخت ہوگی لیکن اب جو خبریں آرہی تھیں، ان سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی یہ توقع پوری نہیں ہو رہی ہے۔
امید تھی کہ فرانس اور جرمنی میں یہ کتابیں فروخت ہوں گی لیکن خوبیٔ قسمت کہ انہی دنوں فرانس اور جرمنی میں لڑائی چھڑ گئی اور کتابیں پڑی رہ گئیں۔

قرض تو کسی نہ کسی طرح اتر گیا تھا لیکن اب اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ وطن واپس آسکے۔ یہ ایسی پریشانی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اس نے دوستوں کو لکھنا شروع کردیا۔ اسی اثنا میں اس کے ایجنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ تمام اخراجات جہاز کے ادا کرکے اسے ہندوستان پہنچادے گا۔

اس یقین دہانی کے بعد اس نے اپنی روانگی کی اطلاع انڈیا آفس کو دے دی۔

سید محمود اپنے ملازم چھجو کے ساتھ کیمبرج روانہ ہوگیا جہاں اسے اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی اور سید احمد، سید حامد اور مرزا خداداد بیگ کے ساتھ ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔

۲اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سید احمد ولایت سے بمبئی پہنچا اور اسی مہینے بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔

○☆○

وہ دل سوز قومی بھلائی کے کئی منصوبے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے ولیم میور کی اسلام دشمن کتاب کا جواب لکھنے میں صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ لوگ اس لیے لندن جاتے ہیں کہ ناچ گھروں کی سیر کریں گے، وہ کتب خانوں کی خاک چھانتا رہا تھا۔ وہ عیش کی محفلوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی تباہی کا خیال کرکے روتا رہا تھا۔

اس کے یہ عزائم تھے دوسری طرف یہ حال کہ جب اس کی واپسی کی خبر ہندوستان پہنچی تو چند بااثر افراد نے وسیع پیانے پر اس کی مخالفت کا سامان کیا۔ دہلی، علی گڑھ اور الہ آباد میں خطوط تقسیم کیے گئے کہ کوئی اس سے نہ ملے اور نہ اس کے ساتھ کھانا کھائے کیونکہ وہ کرسٹان ہوگیا ہے۔

بمبئی میں قدم رکھتے ہی اسے ان خطوط کے بارے میں علم ہوگیا۔

"اب میں کرسٹان ہو ہی گیا ہوں تو وہ تمام کام اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کروں گا جو ان کرسٹانوں کی ترقی کا ضامن بنے ہیں۔ ان میں پہلا کام یہ ہے کہ میں تہذیب الاخلاق جاری کروں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ مدرستہ العلوم قائم کروں۔" اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

دوسری طرف اس کے دو بڑے مخالف حاجی علی بخش خاں سب جج گورکھپور اور امداد العلی، ڈپٹی کلکٹر نے بھی آستینیں چڑھائیں اور مخالفت کا زور باندھا۔

سید احمد نے بنارس پہنچنے کے دو مہینے بعد ہی مخالفین کو دو زبردست دھچکے پہنچادیے۔

۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ شائع ہوگیا۔

سید احمد کے نزدیک جو باتیں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں اس لیے ان پرچوں میں ان مذہبی عقائد پر مضامین لکھے جانے لگے جن کی موجودگی کی وجہ سے سید احمد کے بقول مسلمان ترقی نہیں کرسکتے۔ عبادت کا صحیح مفہوم، پیری مریدی کے طریقے، اہلِ کتاب کے ساتھ معاملات۔

اسی قسم کے دیگر مضامین جب شائع ہوئے تو تیسرے پرچے کی اشاعت کے بعد ہی مخالفتوں کا وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی لیکن سید احمد، مولوی چراغ علی اور سید مہدی علی اپنی دانست میں دینی اصلاح کے کام سے باز نہیں آئے۔

یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور ان کے کان میں ایسی صدائیں پہنچاتا تھا جو اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہ سنی تھیں اس لیے لوگوں کا بھڑکنا لازمی تھا لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو ان خیالات کو پسند کررہے تھے اس لیے سید احمد کی ہمت بندھی رہی۔

مخالفت کی آندھی چل رہی تھی کہ اس نے ایک چراغ اور روشن کردیا۔ اس نے ایک اشتہار جاری کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھارہے ہیں اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے۔ اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہوجانا چاہیے۔ پس مسلمانوں کو اس مسئلے پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور مضامین پر انعامات دیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ اور چندہ دینے والوں میں سے ممبر منتخب کرکے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔

ایک ہی مہینے میں ایک ہزار ایک سو روپے جمع ہوگئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ چندہ آتا رہا۔

۲۶ دسمبر کو یہ کمیٹی وضع ہوگئی جس کے لیے سید احمد کو سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ دریافت کرنے کی کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کیوں کم پڑھتے ہیں اور اسباب معلوم ہونے کے بعد تدبیریں طے کرے اور ان پر عمل درآمد کرے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ سید مہدی علی بھی اس جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ صبح جلسہ ہونے والا تھا۔ سید احمد

نے ان کا پلنگ بھی اپنے کمرے ہی میں بچھوایا تھا۔ رات گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مہدی علی (محسن الملک) کی آنکھ لگ گئی۔ رات دو بجے کے قریب ان کی آنکھ کھل گئی۔ کسی کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ کوئی رو رہا تھا۔ سید احمد کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلے' دیکھتے کیا ہیں کہ سید احمد ٹہلتے جا رہے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔

"خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟" سید مہدی علی نے گھبرا کر پوچھا۔

یہ سن کر وہ اور زیادہ رونے لگے "اس سے زیادہ کیا مصیبت ہوگی کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"

"خدا سب ٹھیک کردے گا۔ کل جلسہ ہونے والا ہے۔" مہدی علی نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"جو جلسہ کل ہونے والا ہے' مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی کہ دیکھیے کل جلسے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ کسی کے کان پر جوں رینگتی بھی ہے یا نہیں؟"

باقی رات اسی کوشش میں گزر گئی کہ دل کو کسی طرح قرار آجائے۔

دوسرے دن سید احمد نے اپنی رپورٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی جس کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان اپنی تعلیم کی فکر خود کریں۔ اسی رپورٹ میں انہوں نے مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقۂ تعلیم بھی بیان کیا۔

اس رپورٹ کی ایک ایک کاپی گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھیج دی گئی۔

گورنمنٹ نے اس کوشش کو سراہا اور وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوششوں سے مجوزہ کالج قائم ہوگیا تو حکومت اس مدرسے کو پوری مدد دے گی۔

انگریز حکام نے خطیر رقومات چندے میں دیں تو سید احمد کی ڈھارس بندھ گئی۔

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلہ تعلیم کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں کا انتظام دیکھ کر مرتب کی گئی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی۔ ممبروں نے اسے منظور کرنے کے بعد گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں کو بھی اس کی نقلیں ارسال کردی گئیں۔

جب یہ اسکیم شائع ہوئی تو سید احمد کے مشہور مخالف مولوی امداد العلی نے کان پور سے جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے' علمائے وقت کے سامنے دو سوال رکھ کر سید احمد کے خلاف تحریک شروع کردی۔ ایک سوال میں سید احمد کے مفروضہ عقائد بیان کر کے لکھا کہ آیا ایسا شخص مسلمان ہے یا کافر؟

دوسرے سوال کا مضمون تھا کہ جس درس گاہ میں ایسی ایسی تعلیم دی جائے اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفتیں ہونا شروع ہوگئیں۔ بعض لوگوں نے مشہور کردیا کہ مدرسے میں سید احمد خاں کا بت اور ان کے معاونوں کی قدِ آدم تصویریں رکھی جائیں گی۔ بعض کہتے تھے وہاں شیعوں کی کتابیں پڑھائی جائیں گی۔ یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ سید احمد کے عقائد درست نہیں لہٰذا اس کے قائم کیے ہوئے مدرسے کو چندہ دینا اور اس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں۔ بعض الزام لگاتے تھے کہ جو روپیا چندے میں دیا جائے گا اسے سود میں لگایا جائے گا اور مدرسے میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے گا۔

یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کا اثر ہونا لازمی تھا۔

اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ مولوی امداد العلی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور علمائے ہند و حرمین کے فتووں کی عبارت کے مطابق سید احمد کو کافر قرار دے دیا گیا۔ ان فقروں پر ساٹھ علما کے دستخط تھے۔

جب ایک مرتبہ اس کا کفر مشہور ہوگیا تو وہ لوگ بھی جو رواروی میں تہذیب الاخلاق کے مضامین کو الٹ پھیر کے دیکھ لیتے تھے' غور سے ان کو پڑھنے لگے۔ دل میں شک آہی گیا تھا' یہ مضامین باغیانہ نظر آنے لگے۔ ان مضامین کا لہجہ اور موضوعات اتنے غیر روایتی تھے کہ جب تک کان ان آوازوں کے عادی نہ ہوجائیں' دل میں اتر ہی نہیں سکتے تھے۔

اور جب تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار یہ لکھتے تھے۔ "ان سب باتوں کو قوم میں پیدا کرنے والا ہماری دانست میں مدرستہ العلوم ہوگا" تو لوگوں کے شبہات بڑھتے جاتے تھے۔

کانپور سے تہذیب الاخلاق کے جواب میں اخبار نور الآفاق اور نور الانوار نکل آئے تھے۔ ان پرچوں نے تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کو مختلف نام دے رکھے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی ملحد تھا' کوئی کافر' کوئی ملعون' کوئی دہریہ تھا اور خود سید احمد کا خطاب زندیق' شیطان اور نیچری تھا۔

لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ ان خطابات کے حامل افراد

جب مدرسہ قائم کریں گے تو جس قسم کے مضامین لکھے جارہے ہیں' اسی قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

بعض لوگ اسے جھگڑے کی جھونپڑی سمجھ کر دور رہنا چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ چندے کی آمد ست پڑنے لگی۔ سیداحمد تو خیر حوصلے کا پہاڑ تھا لیکن اس کے دوست مایوس ہونے لگے۔

اس نے مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات رفع کرنے کے لیے تہذیب الاخلاق میں ایک مفصل مضمون شائع کیا۔ اس کے ساتھ ہی چندہ جمع کرنے کے لیے مختلف شہروں میں سب کمیٹیاں قائم کیں اور خود بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ پٹنہ' لاہور' گورکھپور وغیرہ کا سفر کیا۔

ان کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے جمع تو ہوتے تھے کہ دیکھیں' جس پر کفر کا فتویٰ لگا ہے وہ شخص کیسا ہے لیکن چندے کے لیے ہاتھ نہ بڑھتا تھا۔ جو لوگ اس کی دل میں اتر جانے والی باتیں سن آتے تھے' دوسروں کو منع کرتے تھے کہ جو اس کی باتیں سن لے اپنے خیالات پر قائم نہیں رہ سکتا' اس لیے بہتر ہے نہ سنو۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کمیٹی کے ایک جلسے میں مولوی سمیع اللہ نے تقریر کرتے ہوئے زور دے کر کہا کہ مدرستہ العلوم کی مخالفت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ اسے رفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر کوئی نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ علی گڑھ میں قائم کیا جائے تاکہ اس کا طریقۂ تعلیم لوگوں پر ظاہر ہو اور معلوم ہو کہ اصول اسلام کے برخلاف نہیں اور جب لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں' مخالفت کے بادل چھٹ جائیں تو مدرستہ العلوم کے قیام کی کوششیں تیز کردی جائیں۔

اس تجویز کو تمام ممبران نے بلاعذرِ شرعی تسلیم کیا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا' مدرسے کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔

ہے مدرسہ علی گڑھ میں اک ہوا مقرر
جس کو کیا ہے جاری اسلامیوں نے مل کر
ہر علم و ہر زباں کی تعلیم ہوگی اس میں
سب مدرسوں سے اچھی سب کالجوں سے بہتر
انگریزی عام ہوگی تعلیم میں مگر ہاں
مذہب کی خاص ہوگی تعلیم اے برادر

علی گڑھ میں ایک وسیع میدان تھا۔ کسی زمانے میں یہاں فوج پریڈ کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی۔ کچھ کوٹھیاں بن گئی تھیں مگر اب بھی قریب ۷۲ ایکڑ کی زمین اپنے آباد ہونے کا انتظار کررہی تھی۔

سیداحمد نے مجوزہ کالج کے لیے جس کا نام بہ زبانِ انگریزی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تجویز کیا گیا تھا' اس زمین کو پسند کیا اور کمیٹی کی طرف سے حکومت سے درخواست کی کہ یہ زمین کالج کے لیے دے دی جائے۔

ہنری لارنس' کلکٹر اور سر ولیم میور گورنر نے اس قطعہ اراضی کے دینے کا وعدہ کرلیا لیکن اسی زمانے میں مانٹی گیو صاحب علی گڑھ میں کلکٹر ہوکر آئے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اس کے بعد مسٹر کالان کلکٹر و مجسٹریٹ ہوکر آئے۔ انہوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی بلکہ انہوں نے تو دوسرے حکام کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔ یہ مخالفت اتنی شدید تھی کہ کمیٹی نے مایوس ہوکر یہ خیال ہی دل سے دور کردیا۔

بعض بادل برستے بھی ہیں۔ مایوسی کے یہ بادل بھی برسنے کے لیے تھے۔ سر جان اسٹریچی لیفٹیننٹ گورنر بن کر آئے جو سیداحمد کے ہم نوا تھے۔ ان کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو وہ دورے پر علی گڑھ آئے۔ سیداحمد بھی بنارس سے علی گڑھ پہنچا اور ان سے ملاقات کے لیے گیا۔

بہت کچھ گفت وشنید کے بعد جان اسٹریچی نے دو شرطیں سیداحمد کے سامنے رکھیں۔

"یہ زمین کالج بنانے کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے گی' جو عمارت اس میں بنائی جائے' اس کے بننے سے پہلے اس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظے کے لیے بھیجا جایا کرے۔ دوسری شرط یہ کہ اگر کوئی اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہوجائے تو جس قدر عمارات بنی ہوئی یہاں موجود ہوں گی' ان سب پر سرکار کا قبضہ ہوجائے گا۔"

کمیٹی سے مشورے کے بعد سیداحمد نے یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں۔ جواب میں قطعہ اراضی پر قبضے کی سند کمیٹی کو مل گئی۔

ماتحت مدرسے کو جاری ہوئے ایک سال ہوچکا تھا کہ اراضی کے حصول نے کالج کے خواب کو تعبیر کے قریب پہنچادیا لیکن چٹیل زمین کے سینے پر عمارات کی تعمیر کا کام اتنا مشکل تھا کہ مذاق اڑانے کے لیے مخالفین کے ہاتھوں میں ایک اور کھلونا آگیا۔

ایک اخبار نے لکھا "سیداحمد خاں اور کالج کی تعمیر! اس کی مثال اس کتے کی سی ہے جو آئینے کے سامنے کھڑا ہے اور اپنا ہی عکس دیکھ کر غرارہا ہے اور آخر میں جوشِ غضب سے بے تاب

ہوکر فرضی کتے پر حملہ کرتا ہے۔ آئینہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہ کتا زخموں سے چور ہوکر مرجاتا ہے۔ یہی انجام سید احمد خاں کا ہوگا۔"

سید احمد کے احباب نے اجازت چاہی کہ اس مضمون کا جواب دیا جائے لیکن اس نے یہ کہہ کر سب کو چپ کرادیا۔

"وہ زمانہ قریب ہے جب مدرستہ العلوم کے طلبہ اس اخبار کی بدزبانیوں کا جواب دیں گے۔"

اس کی کامیابی کا راز ہی یہ تھا کہ اس نے کبھی کسی کی ہرزہ سرائی کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنے کام سے کام رکھا۔ اب بھی اس نے یہی کیا۔ کالج کی تعمیر کا مشکل کام سامنے تھا اور اسے مخالفوں کے خیال کو باطل کرنا تھا۔ سرکاری نوکری کی مصروفیات پاؤں کی زنجیریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ خود بنارس میں تھا، تعمیر کے سورج کو علی گڑھ کی زمین پر اترنا تھا۔

اس کی دیوانگی نے ایک جھٹکے سے ان زنجیروں کے فولاد کو پانی کردیا۔ اس نے ملازمت کو پنشن میں تبدیل کیا اور مستقل سکونت کے لیے علی گڑھ چلا آیا۔

"میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں کی ہڈیاں اب تک زمین پر پڑی ہیں، صرف مدرستہ العلوم کی محبت اور اپنی قوم کی بھلائی سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔"

کالج کی تعمیر کے لیے سب سے مشکل مگر سب سے ضروری کام چندے کے وصول کرنے کا تھا۔

جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے۔ دوسرے تہذیب الاخلاق جاری ہوچکا تھا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے لہٰذا مدرستہ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کے خلاف بے شمار مضامین چھپ رہے تھے اور سید احمد کو کافر قرار دیا جاچکا تھا۔ مولوی حضرات وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ ایسے میں کون اس کی جھولی میں سکے ڈالتا۔ رہ گئے قریبی احباب تو وہ بار بار اعانت کرتے کرتے تھک چکے تھے۔

سید زین العابدین خاں سے چندے کا تقاضا کیا۔ وہ بدمزہ ہوگئے۔

"صاحب، ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔"

"ارے میاں، اب کوئی دن میں ہم مرجائیں گے۔ پھر کون تم سے چندہ مانگنے گا۔"

اس کی چندہ مانگنے کی عادت اتنی مشہور ہوگئی تھی کہ بعض لوگ اسے دیکھتے ہی چھپ جاتے تھے کہ کہیں چندہ نہ مانگ بیٹھے۔ اب تو اس کے بدترین مخالف اکبر الہ آبادی کو بھی یہی مضمون سوجھ رہا تھا۔

ہے یہی بہتر علی گڑھ جاکے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

چندے تو اس نے بہت لیے تھے لیکن اب کے معاملہ سخت تھا۔ کالج کی پوری عمارت سامنے تھی اور نقشہ ایسا بنا تھا کہ کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو اور مسلمانوں کی قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگیں۔

ایسی شاندار عمارت مفت میں نہیں بن سکتی تھی اور ایسی قوم اور ایسے حالات سے واسطہ تھا کہ ایک پیسے کی امید نہیں تھی لیکن دنیا نے دیکھا کہ اس نے چندے کو بھی ہنر بنادیا۔ ایسی ترکیبیں ایجاد کیں کہ کنجوسوں کو فیاض بنا کر چھوڑا۔

ایک تدبیر تو یہ نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کرکے اس کو متعدد حصوں میں تقسیم کردیا اور اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیا خرچ ہوتا ہے۔ جو شخص اتنا روپیا دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کرایا جائے گا۔ مثلاً جو شخص ایک دروازہ بنادے اسی کے نام سے اس دروازے کو نامزد کرنا تجویز ہوا۔

تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ الزام یہی لگا کہ یہ غیر شرعی ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی۔

اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کیں۔ ایک دوست قبائل کے دور دراز سفر سے علی گڑھ آئے۔ وہ سید ہونے کے ناتے امام ضامن کا روپیا مانگنے کے لیے وہاں پہنچا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آگئے۔

علی گڑھ میں نمائش لگی تو کتابوں کی دکان لگائی اور دکان پر کھڑے ہوکر کتابیں بیچیں۔ نیشنل والنٹیئر بن کر گلے میں جھولی ڈالی۔ اسٹیج پر کھڑے ہوکر اپنی بھاری اور بے ہنگم آواز میں غزلیں گائیں۔

"کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور شیخیت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ، اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں، انہیں بے عزتی کے کام

سمجھیں۔"

مجرے میں پہنچ گیا۔ طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسے کی حقیقت سن کر خوشی سے چندہ دیا۔

اس نے دور دراز کے سفر کیے۔ جس دوست نے دعوت کرنی چاہی' اس سے دعوت کے بجائے نقد رقم وصول کی اور کالج کے فنڈ میں جمع کرادی۔

ایک اجنبی مسافر انگریز ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سید احمد نے تعارف نہ ہونے کے باوجود اس سے چندے کی رقم طلب کی۔

"آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔" انگریز نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"بے شک! ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہ ہندوستان کی حکومت سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے متعلق کاموں میں شریک نہیں ہوتے" سید احمد نے کہا۔

وہ انگریز یہ سن کر اتنا شرمندہ ہوا کہ اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سید احمد کی نذر کیا۔

اس نے یہ سوچے بغیر کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں' کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں کبھی شرمندگی محسوس نہیں کی۔ اس ایک شخص نے اتنا چندہ جمع کیا کہ ہندوستان کی تاریخ میں کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ چراغ کا جن بن گیا اور ایک ویران قطعہ زمین کو چند سال میں محض قومی چندے سے ایسا گلزار بنادیا کہ سب کے تبصرے غلط ہو گئے۔

اس نے یہ کام اتنی لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان اس کے گرویدہ ہو گئے اور اس کے معاون بنتے گئے۔ سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اس کی طرف التفات ظاہر کرنے لگے اور ہر شخص کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب ہونے لگی۔

صرف تین سال گزرے تھے کہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی۔

لندن کے سفر سے قومیت کے جس احساس کو لے کر وہ ہندوستان آیا تھا' اس کی روح دوسروں کے جسموں میں تو نہیں پھونک سکا لیکن خود مجسم قوم بن گیا اور وہ کام جو پوری قوم مل کر کرتی ہے' اس نے اکیلے کر دکھایا۔

مخالفت کرنے والے اب بھی کر رہے تھے۔ منشی سجاد حسین نے اخبار اودھ پنچ نکالا اور پورا اخبار سید احمد کی مخالفت کی نذر کردیا۔ اس کے ہر سنجیدہ کام کو ہنسی میں اڑایا' طنز کے سپرد کردیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی پوری شاعری سید احمد تحریک کی مخالفت میں خرچ کردی۔ وہ کہتا رہا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

سید احمد ہنستا رہا لیکن وہ جو بہتر سمجھتا رہا وہی کرتا رہا۔

اس کی مخالفت کرنے والوں میں مختلف خیال کے لوگ شامل تھے۔ بعض اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے مداح تھے لیکن سماجی اصلاحات کو پسند نہ کرتے تھے۔ بعض سماجی اصلاحات کو سراہتے تھے لیکن تعلیمی پروگرام کو گمراہ کن خیال کرتے تھے۔ بعض انگریزوں سے میل جول کو ناپسند کرتے تھے' بعض مذہبی تحریروں کے سبب اسے ناپسند کرتے تھے۔ بعض اصلاحی پروگرام کے خلاف تھے' بعض اس کی عقلیت پسندی کو پسند نہ کرتے تھے۔

اس اکیلی جان نے اتنے آزار پال لیے تھے کہ جتنے مداح تھے اس سے زیادہ مخالف تھے۔

مداحوں اور مخالفوں کے درمیان وہ اکیلا تھا مگر اس کے کام اکیلے آدمی کے کام نہیں تھے۔

○☆○

تہذیب الاخلاق اپنا کام کرکے بند ہو چکا تھا لیکن اس کے نتائج اتنے دور رس نکلے تھے کہ اگر یہ پرچہ نہ نکلا ہوتا تو شاید سید احمد کے تعلیمی مقاصد بھی پورے نہ ہوئے ہوتے۔ اس میں شائع ہونے والے ۲۲۶ مضامین نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو پھر سے تازہ کردیا۔ وہ اپنی دھن میں گاتا رہا۔ یہاں تک کہ جو وہ کہتا تھا' وہی بہت سے کہنے لگے۔

تہذیب الاخلاق جس قدر انگریزی تعلیم کی طرف بلاتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ یہ اسی پرچے کا اثر تھا کہ بے شمار اسلامی مدارس قائم ہو گئے۔

سید احمد نے مسلمانوں کے اسلاف کا حال ایسے مؤثر طریقوں سے بیان کیا کہ مسلمانوں میں فخر و مباہات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا ہو گیا۔

عیسائی مورخوں نے اسلام اور مسلمانوں پر جو الزامات عائد کیے تھے' اس پرچے نے آہستہ آہستہ دونوں طرف کی غلط فہمیوں کو زائل کردیا۔ قوم' قومیت' قومی ہمدردی اور قومی اتحاد کے الفاظ اس شدت سے دہرائے گئے کہ ان کے معنی ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمان کے ذہنوں میں راسخ ہو گئے۔

اردو لٹریچر کو بھی اس پرچے سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا بلکہ یہی وہ شعبہ ہے جو سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ پہلی مرتبہ یہ اعتماد پیدا ہوا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔

اس پرچے کے مضامین نے اردو نثر کا اسلوب ہی بدل کر رکھ دیا۔ جو تبدیلی صدیوں میں نہیں آسکتی تھی، برسوں میں آگئی۔ اسی پرچے کے ذریعے ادیبوں نے جانا کہ تحریر سادہ ہونی چاہیے۔ لطف مضمون میں ہو نہ کہ ادا میں۔ اس پر ایمان ہوا کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ نثر اردو پہلی مرتبہ اجتماعی مقاصد سے روشناس ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کا خزانہ ہر قسم کے موضوعات سے آباد ہو گیا۔ جو اس کی مخالفت کرتے تھے، وہ بھی اس کے طرزِ اسلوب میں بات کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قدیم نثر رخصت ہوئی اور اردو ادب نے جدید دور میں قدم رکھا۔

"جو چیزیں اس کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔" (شبلی)

اردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے، اس نے بھی زیادہ تر اسی پرچے کی تحریک سے کروٹ بدلی۔ نئے نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے۔ مبالغے اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچے جانے لگے۔ اصلاحی مقاصد پیشِ نظر رہنے لگے۔

الطاف حسین حالی کی نظم مدوجزر اسلام (مسدس حالی) مسلمانوں کی حالت دہراتے ہوئے بیشتر وہی مضامین دہرائے گئے تھے جو سید احمد کے نظریات تھے۔ اردو شاعری میں پہلی مرتبہ قومی شاعری کی گونج سنائی دی۔

○☆○

۱۸۷۸ء میں سید احمد کو لارڈ لٹن نے لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا۔

اس نے بہت پہلے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھ کر یہ شکایت کی تھی کہ کونسلوں میں ہندوستانیوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ یہ حکومت کی نہیں، اس کی کامیابی تھی کہ حکومت نے اپنے نقص کو محسوس کیا۔

اس کی عملی فطرت نے یہاں بھی اثر دکھایا۔ مختصر سے عرصے میں اس نے دو مسودے پیش کیے اور پاس کرائے چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔

اس کے بعد لارڈ رپن نے اسے ممبری کونسل کے لیے منتخب کیا۔

وہ جب تک کونسل میں ممبر رہا، غیر معمولی لیاقت کا مظاہرہ کیا۔ انگریزی سے مکمل واقفیت نہ ہونے کے باوجود تمام کاغذات کسی کے ذریعے سمجھتا۔ اس پر گفتگو کرنے کے لیے اردو میں مسودہ تیار کراتا، اس کا ترجمہ کراتا اور انگریزی ترجمے کو فارسی حرفوں میں لکھ کر اسپیچ دیتا۔ یہ ایسا مشکل کام تھا کہ بظاہر ممکن نظر نہ آتا تھا لیکن وہ تو ناممکن کو ممکن کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔

○☆○

وہ دیکھ رہا تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پا رہے ہیں، ان کے دل میں عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہی ہے۔ اور جو کوئی بات بظاہر قانونِ قدرت کے خلاف ہو اس کو یا تو تسلیم نہیں کرتے یا شک میں پڑ جاتے ہیں۔ آئندہ چل کر جو نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر معاشرے میں داخل ہوں گے، وہ اسلام کے ہر عقیدۂ قانون کو عقل سے جانچیں گے اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔

اس نے سوچا، جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے۔ اسی طرح اس کے مقابلے کے لیے ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔ ایک ایسا علم کلام جس سے یا تو علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھہرا دیں یا اسلامی مسائل کو ان سے مطابق کر دکھائیں۔

اس نے طے کیا کہ ایک نئی تفسیر القرآن لکھی جائے جس میں اسلام کے ہر عقیدے، ہر قانون، ہر حکم، ہر قصے کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے، اسے ٹکسال باہر کیا جائے۔

اسلام پر ہی منحصر نہیں، کسی بھی مذہب کو سمجھنے کے لیے یہ ایک غلط طریقۂ کار تھا لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق ضدی بچے کی طرح مچل گیا۔ قرآنی آیات کی تفسیر میں عقلی تاویلوں سے کام لیتا رہا۔ بقول اکبر۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

اپنے سمجھاتے رہے، غیر لعن طعن کرتے رہے لیکن وہ قرآن کو عقل سے سمجھنے پر تل گیا۔ نتیجے میں تمام معجزات اور خلافِ عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا پڑا۔ ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنی پڑی۔ جنوں سے صحرائی قوم مراد لی۔ اس سے آگے بڑھ کر جنت، دوزخ، فرشتوں اور شیطان کو نئے معنی پہنائے۔

"مسلسل دنیاوی کامیابیوں نے اس کی خودرائی یا جو وثوق کہ اس کو اپنی آرا پر تھا حدِ اعتدال سے متجاوز کر دیا تھا۔ بعض

آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتا تھا جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔" (حالی)

بقول حالی' اس نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائیں اور بعض بعض مقامات پر نہایت رکیک لغزشیں ہوئیں لیکن وہ برابر اسے لکھنے میں مصروف رہا۔

کالج اب ترقی کرنے لگا تھا۔ نئی نئی کمیٹیاں بن رہی تھیں' نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اس پودے کو زہریلی آب و ہوا سے بچانا بھی تھا۔ پہلے پھونکنا تھا پھر قدم رکھنا تھا۔ اعتراضات کی بارش تھی۔ خیر خواہ کم تھے' ہنسنے والے زیادہ تھے۔ وہ ان حالات سے جو کھی لڑ رہا تھا۔ دن رات کی محنت تھی اور صلہ کوئی نہیں۔

یہی بکھیڑے کیا کم تھے کہ اسے سیاست کے خارزار میں بھی قدم رکھنا پڑ گیا۔

ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ سید احمد کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن جب اس زک مسلمانوں پر پڑتی نظر آئی تو اسے یہاں بھی دخل دینا پڑا۔

انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی۔ اس پر بنگالیوں کا بڑا اثر تھا۔ بابو سریندر ناتھ بینرجی ہندوستان بھر کے دورے کر رہے تھے۔ ان کے یہ دورے سید احمد کے دل میں کھٹک پیدا کرنے لگے تھے۔

انہی دنوں ایک رسالہ شائع ہوا جس میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ انتظام ایسے طور پر ظاہر کی گئی تھی جس سے عاقبت نا اندیشوں کے دلوں میں گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

وہ ۱۸۵۷ء کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ایسی فضا پھر قائم ہو اور اگر ہو تو اس میں مسلمان کیوں شامل ہوں؟

یہ جماعت ہندوؤں نے قائم کی تھی اور سید احمد کے خیال میں اسے اپنی قوم کی بھلائی مقصود تھی۔ پھر مسلمان اس میں شامل ہو کر اس کی طاقت میں اضافہ کیوں کریں؟ اس کا ایندھن کیوں بنیں۔

اس نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور اس کے پلیٹ فارم سے کانگریس کی مخالفت شروع کر دی اور مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا۔

اگست ۱۸۸۸ء میں اس نے "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں لور جو رئیس' تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں' ان کے خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ چھپوا کر انگلستان اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے بھیجی جا سکے۔

اس کے نتیجے میں مختلف شہروں میں کانگریس کے خلاف جلسے منعقد ہونے لگے۔ بنگالی اخباروں میں سید احمد کے خلاف آرٹیکل لکھے جانے لگے۔ ان آرٹیکلز کے جواب بھی دینے تھے' جلسوں کے انتظام بھی کرنے تھے۔ جو قدم اٹھایا تھا' اسے برقرار بھی رکھنا تھا۔ مخالفت کا نیا دروازہ کھل گیا تھا۔ علی گڑھ کو اس سے بچانا بھی تھا۔

اس کی یہ سرگرمیاں ایسی تھکا دینے والی تھیں کہ اگر مسلمانوں کا مفاد عزیز نہ ہوتا تو ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

۱۸۸۸ء میں اسے اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند" سے ممتاز کیا گیا۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علی گڑھ کے رئیس اور اس کے ہندو' مسلمان' یورپین دوست اور تمام اسٹیشن کے انگریز جمع ہوئے۔ سید احمد جونہی ہال میں داخل ہوا' تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ تعلیمی گارڈ نے ہتھیاروں سے سلامی دی۔ اس کے بعد فرمان شاہی پڑھ کر سنایا گیا جس میں اسے اس اعزاز سے ممتاز و نامور کرنے کا تذکرہ تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ستارۂ ہند اس کے سینے پر سجا دیا گیا۔

۱۸۸۹ء میں ..... ایڈنبرا یونیورسٹی سے اسے بہ حیثیت ایک اعلیٰ منصب اور حامیِ علوم ہونے کے ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری دی گئی۔

○☆○

اس نے کالج کے عشق میں اتنے روگ اپنی جان کو لگا لیے تھے کہ ایک آدمی کا اتنے کاموں سے عہدہ برآ ہونا معجزے سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اسی عشق نے اسے وہ دھچکا پہنچایا جس کا سامنا اسے زندگی میں کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

ایک شخص شام بہاری لال' سید احمد کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ کالج کے جتنے اخراجات ہوتے تھے' سید احمد کے ہاتھوں ہوتے تھے اور یہ شخص بہ حیثیت کلرک حساب کتاب رکھتا تھا۔

کالج کا بہت سا روپیہ بینک بنگال میں جمع رہتا تھا اور حسب ضرورت چیکوں کے ذریعے وصول کیا جاتا تھا۔ کچھ پرامیسری نوٹ بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول کیا جاتا تھا۔

چیک بک سید احمد کی تحویل میں رہتی تھی۔ جب چیک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، شام بہاری لال سید احمد سے کنجی لے کر چیک بک نکال لیتا اور خانہ پُری کر کے دستخط کرالیتا۔ ہمیشہ سے یہی دستور تھا۔ شام لال کوئی نیا آدمی تو تھا نہیں۔ اسے اس عہدے پر کام کرتے ہوئے دس بارہ سال ہو گئے تھے۔ سید احمد اس پر اعتماد کرنے لگا تھا اور جیسا کہ دفتروں میں ہوتا ہے، اکثر بغیر پڑھے دستخط ہو جاتے اور وہ بینک سے پیسے نکلوا لیتا۔

اس نے جب دیکھا کہ سید احمد اس پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگے ہیں تو اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ جس قدر روپے چاہتا نکلوا لیتا۔ پھر اس نے جعلی دستخط بنانے شروع کردیے۔ یہاں تک کہ زرِ ضمانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا۔ اب اس نے ایک اور دلیری کا کام کیا۔ پرامیسری نوٹ جو بینک کی سپردگی میں تھے، ان پر سودی قرض لینے کا ارادہ کیا۔ اس نے کالج کے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک مختار نامہ بنایا اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط بنا کر بینک کو بھیج دیے۔ اس مختار نامے کے ذریعے بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ جس قدر روپے کی کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیا قرض دیتا رہے۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شام لال اپنی عیاشیوں کے لیے کالج کے نام پر قرض لے لے کر خورد بُرد کرتا رہا۔

ایک دن بہاری لال کی درخواست آئی کہ وہ بہ سبب علالت دفتر آنے سے قاصر ہے۔ پھر معلوم ہوا اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ ایسے محنتی کارکن کی اچانک بیماری سید احمد کے لیے فکر کا باعث تھی لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے کچھ دن کے لیے ایک اور کلرک کو مقرر کرلیا۔ اس کلرک نے حساب کتاب کا جائزہ لینے کے لیے رجسٹروں کا معائنہ کیا۔ اسے کچھ شک ہوا لیکن وہ نیا آدمی تھا زیادہ گہرائی میں نہ جا سکا۔

اب بہاری لال تو تھا نہیں کہ بینک سے آنے والی چٹھیاں غائب کرکے معاملے کو روشنی میں آنے سے روک سکتا۔ بینک سے کچھ چٹھیاں موصول ہوئیں۔ نئے کلرک نے ان چٹھیوں کا مضمون سید احمد کے گوش گزار کیا۔ ان چٹھیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی جعل سازی ہوئی ہے۔ نیا کلرک اب تمام معاملہ سمجھ چکا تھا۔ اس نے چیک بکیں دیکھیں۔ چیک کے وہ حصے جو چیک بک میں لگے رہتے ہیں، اکثر بغیر لکھے ہوئے تھے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ چیک کتنی رقم کا جاری ہوا۔ ان نمبروں کے کسی چیک کی روانگی روزنامچے میں مندرج نہیں پائی گئی۔

دفتری کارروائی مکمل کرنے کے بعد سید احمد نے جب بینک سے خط و کتابت کی تو تمام چوریاں من و عن ظاہر ہو گئیں۔ بہاری لال ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہڑپ کر چکا تھا۔

سید احمد نے ذلت و خواری اٹھا کر قطرہ قطرہ کرکے تالاب بھرا تھا۔ یہ اس کی نہیں، قوم کی رقم تھی جس کا وہ امین تھا۔ اس کے مخالف موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اس نے قوم کی امانت ہڑپ کرلی۔

اس نے فوراً ٹرسٹیوں کے مشورے سے اس واقعے کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیج دی۔ شام بہاری لال فوراً گرفتار کرلیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ مقدمہ چلتا، اس نے حوالات میں خودکشی کرلی۔

یہ بات اپنی جگہ پھر بھی برقرار تھی کہ ایک کلرک اتنے عرصے تک آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا اور راز کھلنے سے پہلے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ حساب کی جانچ پڑتال کرتا۔

ٹرسٹیوں کے اجلاس میں سید احمد نے اپنی صفائی پیش کی اور ثابت کیا کہ وہ بہ حیثیت سیکریٹری اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیتا رہا۔ اب کسی کے دل میں بے ایمانی آگئی اور اس نے جعلی چیکوں کے ذریعے رقم نکلوالی تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک دلی سے دھوکا کھا گیا۔ وہ اس میں شریک نہیں تھا، قصوروار ضرور ہے۔

ٹرسٹیوں نے اس کی وضاحت کو سنا اور بالاتفاق اسے بے قصور قرار دے کر اعتماد کا ووٹ پاس کردیا۔

کہنے والوں کا منہ کوئی کیسے بند کر سکتا ہے۔ یہ پھر بھی کہا گیا کہ ٹرسٹی اگر اعتماد کا ووٹ پاس نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ وہ خود اس الزام میں جس سے انہوں نے سیکریٹری کو بری کیا، سیکریٹری کے شریکِ غالب تھے۔

ٹرسٹیوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی سال در سال میں کبھی اپنے فرض کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کی جانچ پڑتال کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔

سید احمد کے لیے البتہ ایک اطمینان کی بات تھی کہ یہ راز اس کی زندگی ہی میں کھل گیا۔ اگر اس کی موت کے بعد یہ جعل سازی ظاہر ہوتی تو لوگ اسی کو قصوروار ٹھہراتے۔ شام لال کی بیماری نے اس کے دامن پر لگنے والے دھبے کو دھو دیا۔

اسی اطمینان نے اسے سنبھالا دیا۔ اس صدمے سے وہ مغلوب ضرور ہوا لیکن وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے مطابق برابر انجام دیتا رہا۔

کالج کی تعمیر بند ہو چکی تھی۔ چندے کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ اس واقعے سے اتنی بدنامی ہو گئی تھی کہ لوگ اپنی رقم

دیتے ہوئے کترانے لگے تھے۔ اب وہ کس منہ سے کسی کے پاس جاتا۔ لوگوں کو کیسے یقین دلاتا کہ ان کی رقم قوم کی بھلائی کے کاموں میں خرچ کی جائے گی۔

ان مشکلات کے باوجود وہ اس نقصان کے تدارک سے غافل نہیں تھا۔ کئی منصوبے زیرِ غور تھے جن پر عمل کر کے وہ کالج کی آمدنی میں اضافہ کرسکتا تھا لیکن جب وہ چھت ہی گرجائے جس کے نیچے کوئی بیٹھا ہو تو پھر اسے سورج کی تپش سے کون بچاسکتا ہے۔

اپنے بیٹے سید محمود پر اسے بڑا ناز تھا۔ اس کی قابلیت پر وہ کیا پوری قوم فخر کرنے کو تیار تھی لیکن اس کی کثرتِ شراب نوشی نے سید احمد کے دل پر گھاؤ ڈال دیے تھے۔ وہ تو یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا اس کا جانشین بن کر اس کے لگائے ہوئے پودے کو پانی دے گا لیکن اس کے کردار پر سب کی انگلیاں اٹھتی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے چاہا تھا کہ اسے سیکریٹری منتخب کرلیا جائے لیکن تمام ٹرسٹیوں نے ایسی سخت مخالفت کی کہ سید احمد نے اسے اپنی بے عزتی تصور کر کے اس صدمے کو دل سے لگالیا۔

بالآخر ایک موقع پر کالج کمیٹی نے سید محمود کو جوائنٹ سیکریٹری بنانا قبول کرلیا لیکن وہ ہوش میں رہتے ہی کہاں تھے جو اپنی ذمّے داریاں پوری کرتے۔ سید احمد کو اس کا بڑا قلق تھا۔ جس محمود کو اس نے ماں بن کر پالا' بڑے فخر سے انگلستان لے کر گیا' اس سے کیا کیا امیدیں ہوں گی لیکن محمود کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔

ٹرسٹی بل پاس ہونے کے بعد جسٹس محمود کو سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا اور وہ علی گڑھ آکر باپ کا ہاتھ بٹانے لگے۔ سید احمد کو توقع بندھی کہ اب وہ اپنی عادت پر قابو پالے گا لیکن یہ خیال پانی کے نقش کی طرح مٹ گیا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے تربیت یافتہ لوگ قوم کا نام روشن کررہے ہیں لیکن خود اس کا بیٹا اس کی ناموری کو شراب میں گھول رہا ہے۔ یہ غیرت اُلگ کھائے جارہی تھی کہ دنیا کیا کہے گی۔ یہی ناکہ دنیا کی اصلاح کا دعویٰ کرنے والا خود اپنے بیٹے کی اصلاح سے عاجز رہا۔ جو باتیں کبھی دوسرے کہتے تھے' اب خود اس کی زبان پر آنے لگی تھیں۔

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے ہیں اور جن سے قوم کی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم بنتے جاتے ہیں۔"

یہ بات اس نے جس دکھ سے کہی تھی' وہ دکھ اس کی ہڈیوں میں اتر گیا تھا۔ اس کا دکھ اب یہ تھا کہ قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے' اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی۔

حوصلے کا یہ پہاڑ' غم کی چنگاریوں سے پگھلنے لگا۔ قومی کام تو عادت بن گئی تھی لیکن اب وہ ہنستا بھول گیا تھا۔

مسلسل شراب نوشی نے سید محمود کی دماغی حالت خراب کردی تھی۔ متشرع باپ کے ساتھ نباہ مشکل نظر آنے لگا اور وہ علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ چلا گیا۔

لکھنؤ میں باپ کی نظروں سے دور تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ سید احمد کو اس کی علالت اور خرابیِ دماغ کی اطلاعات برابر مل رہی تھیں۔

یہ صدمہ اندر ہی اندر کام کرتا جارہا تھا۔ بیٹے کی شکایت کرتا تو کس سے کرتا اور کیا کہتا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ چپ سادھ لے۔

اس نے ایسی خاموشی اختیار کرلی کہ دوستوں کو الجھن ہونے لگی۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتے' ہاں اور نہیں کے سوا کچھ سننے کو نہ ملتا۔ ضروری باتوں کا جواب دینا بھی اس نے خود پر حرام کرلیا تھا۔

ایک دن اس کے دوست سید زین العابدین خاں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا "آپ ہر وقت خاموش کیوں رہنے لگے ہیں۔"

"اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈال رہا ہوں۔"

اس خرابیِ مزاج کے باوجود کالج کی بہبودی کا خیال دل سے نہ نکلا۔ متعدد آرٹیکل تعلیم پر لکھے۔ اردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اٹھا تو اس نے اپنی رائے کی طرف گورنمنٹ کی توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اردو زبان کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی' اس سے خط و کتابت کرتا

"سرسید احمد کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے تھے۔"

(خالدہ ادیب خانم)

رہا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے اور وہ موت کے کتنے نزدیک پہنچ چکا ہے۔

ایک عیسائی نے رسالہ امہات المومنین کے خلاف شائع کیا تھا۔ ایک دن محسن الملک اس سے ملنے آئے تو یہ رسالہ بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سید احمد کی نظر اس دل آزار رسالے پر پڑے لیکن اس نے دیکھ ہی لیا اور اشارے سے رسالہ طلب کیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس میں چند باتیں ایسی ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی طبیعت مکدر ہوگی۔"

"میں تو اب ان بدمزگیوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ لاؤ دکھاؤ۔"

محسن الملک نے یہ رسالہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ جوں جوں اس رسالے کے ورق پلٹتا جاتا تھا، اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔

"انگریز ہوتے ہوئے یہ شخص کتنا نادان ہے۔ سچ ہے، اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔"

"چھوڑیے، آپ دل برا نہ کریں۔"

"کس دل سے کہتے ہو، دل برا نہ کروں۔ اس شخص کی لغویات کا جواب دینا مجھ پر فرض ہے۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں۔ میرے بعد کس کو توفیق ہوگی کہ جواب لکھتا پھرے۔ لوگ گواہ تو رہیں گے کہ سید احمد مرتے دم تک اسلام کا دفاع کرتا رہا۔ لوگ مجھے نیچری کہتے ہیں، کافر بتاتے ہیں، کرشان ہونے کے طعنے دیتے ہیں لیکن میرا معاملہ میرے خدا سے ہے۔ تم بھی گواہی دینا کہ سید احمد، امہات المومنین پر اعتراضات پڑھ کر کیسا تڑپ گیا تھا۔"

اس نے رسالے کو توجہ سے پڑھنا شروع کیا اور اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

ایک ہفتے کی مسلسل محنت نے اسے نڈھال کر دیا۔ ابھی جواب مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ سول سرجن علی گڑھ اسے دیکھنے آئے۔ میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موریائی کو بھی مشورے کے لیے بلا لیا گیا۔

دونوں معالج بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

علاج کی یہ تدبیریں صرف تین دن کارگر ہو سکیں۔ ۲۷ ویں مارچ ۱۸۹۸ء کی صبح کو نہایت سخت درد سر لاحق ہوا۔ اسی دن شام کو لرزے کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی ہی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ وہ کچھ کہہ ضرور رہا تھا لیکن اس کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی۔ رات دس بجے کے قریب اس نے دنیا کو آخری مرتبہ دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتے تھے
نہ پوچھو فرق کیا ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرستہ العلوم کا کل اسٹاف اور تمام طالب علم۔ اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانی افسر اور اہل کار۔ علی گڑھ کے رئیس اور ہر درجے کے مسلمان، ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازے کے ساتھ تھے کہ علی گڑھ میں اس نوعیت کا ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔

راج، مزدور، بڑھئی، سنگ تراش جو کالج کی تعمیر کا کام کر رہے تھے، وہ اور ان کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ خبر سن کر آئے تھے، جنازے کی گزرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے اپنے مربی کے جنازے کو تک رہے تھے۔ طالب علم زار و قطار روتے ہوئے ساتھ چل رہے تھے۔

کرکٹ فیلڈ میں جنازے کی نماز ہوئی۔ نماز کے بعد جنازہ بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوا۔ یہاں کی دیواریں اپنے محسن پر سوگواری کے پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ یہاں موجود گارڈ آف آنر نے جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا پریذیڈنٹ آف آرمس کی سلامی اتاری۔

مغرب کا وقت قریب تھا۔ مسجد مدرستہ العلوم کے شمالی پہلو پر تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطے کے اندر تھی، وہاں قبر کھودی گئی تھی۔ مغرب کی اذان سے قبل یہ سورج اس قبر میں غروب ہو گیا۔

تفسیر القرآن ابھی آدھی سے زیادہ باقی تھی، امہات المومنین کے رسالے کا جواب ادھورا تھا، کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خواب ابھی خواب تھا کہ سید احمد کی زندگی مکمل ہو گئی۔

"وہ ایک جواں مرد تھا جو خود مر گیا، اس کا فیض زندہ ہے جیسے رو کی گزرگاہ۔ جب رو کا پانی نکل جاتا ہے تو مویشیوں کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے۔"